مجلس ادارت

۱۔ پروفیسر نذیر احمد، علی گڈھ ۲۔ مولانا سید محمد رابع ندوی، لکھنؤ

۳۔ مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی، کلکتہ ۴۔ پروفیسر مختار الدین احمد، علی گڈھ

۵۔ ضیاء الدین اصلاحی (مرتب)

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

نوٹ: (ہندوستانی روپے کے حساب سے رقم قبول کی جائے گی۔)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ----- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۸۰ ماہ رمضان المبارک و شوال المکرم ۱۴۲۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۰۷ء عدد ۴

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ای میل: email: shibli_academy@rediffmail.com

ویب سائٹ: www.shibliacademy.org

شذرات

ہندوستان رشیوں منیوں کا وطن اور صدیوں سے مذہب، اخلاق، روحانیت، محبت اور رواداری کا گہوارہ ہے مگر اب وہ روحانی، اخلاقی اور سیاسی انحطاط کی حد انتہا کو پہنچ گیا ہے، مادیت اور حرص وطمع نے لوگوں کو اندھا بہرا کردیا ہے، اس لیے ظلم واستحصال اور دھوکا اور فریب کے تمام طریقے روا سمجھ لیے گئے ہیں اور ہر غلط اقدام اور نازیبا حرکت پسند کی جاتی ہے، بدعنوانی اور لین دین کے نتیجے میں سراسر ظلم وناانصافی پر مبنی کام آنا فانا ہوجاتے ہیں لیکن صحیح اور جائز کام کے انتظار میں آدمی کا وقت موعود آجاتا ہے، یہ مادہ فاسد ادنی طبقوں، تیسرے اور چوتھے درجے کے ملازمین ہی میں نہیں بلکہ اعلا طبقوں، بڑے مناصب اور اونچی کرسیوں پر فائز لوگوں میں بھی سرایت کرگیا ہے، علمی وتعلیمی دنیا جو کبھی مردم سازی اور آدم گری کا کارخانہ تھی مسموم اور پر منفعت کاروبار ہوگئی ہے، پرائیویٹ اور سرکاری تعلیمی اداروں میں طلبا کے داخلے اور اساتذہ کے تقرر میں اہلیت وصلاحیت اور اداروں کے مفاد کے بہ جائے ان امور کو مدنظر رکھا جاتا ہے جو تعلیمی معیار کی پستی اور اداروں کی تباہی کا موجب ہوتے ہیں، ایسے اداروں میں ڈسپلن اور طلبہ واساتذہ پر منتظمین کا اور طلبہ پر معلمین کا کوئی اثر کیسے رہ سکتا ہے، جب تعلیم اخلاقی بحران کے سایے میں ہوگی اور نظام تعلیم پر مادی اثرات چھائے ہوں گے تو ایسے اہل اور لایق افراد نہیں پیدا ہوں گے جو اپنے کاموں کو ذمہ داری اور دیانت داری سے انجام دیں، سرکاری ملازمت ہو یا کوئی قومی خدمت اور اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کی نمائندگی، یہ کسی کے ساتھ بھی نہ انصاف کرسکیں گے اور نہ اس کا حق ادا کرسکیں گے بلکہ کبھی تو خود اپنا بھی زیاں کر بیٹھیں گے، اتر پردیش کی سابقہ حکومت نے ہزاروں اردو اساتذہ کے تقرر کیے تھے کہا جاتا ہے کہ ان میں وہ بھی تھے جو سرے سے اردو جانتے ہی نہیں تھے، اب ظاہر ہے کہ ان کا اور دوسروں کا تقرر کس طرح کیا گیا ہوگا مگر ماضی کی یہ تمک ودو جس امید پر کی گئی تھی ہائی کورٹ کے فیصلے نے اس پر پانی پھیر دیا۔

سیاسی دنیا کی حالت تو اور زیادہ بدتر ہے، یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ، تعلیم یافتہ، ذمہ دار اور باوقار لوگ سیاست کے پست اور گرتے ہوئے معیار کو دیکھ کر اس کی طرف رخ کرنا بھی پسند نہیں کرتے بلکہ اس سے بالکل بے تعلق ہوکر یہ میدان وہ مافیاؤں، جرائم پیشہ لوگوں اور غشیات اور اسمگلنگ کرنے والوں اور فلمی ایکٹروں کے حوالے کرتے جارہے ہیں، کسی ملک کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ اس کا دانش ور اور مدبر طبقہ ملک کے نظم ونسق کو سنبھالنے کے بہ جائے اسے ناپسندیدہ اور بدکردار لوگوں کے حوالے

کردے اور خود اس سے کنارہ کش رہے، پانی اتنا سر سے اونچا ہوگیا ہے کہ اب اس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی ہیں اور ناپسندیدہ عناصر کو سیاست میں آنے سے روکنے کی باتیں کی جارہی ہیں، مرکزی الیکشن کمیشن نے بھی زور دیا ہے کہ مجرم اور سزا یافتہ لوگوں کو الیکشن لڑنے کے لیے نااہل قرار دیا جائے لیکن جب اس حمام میں سب ہی برہنہ ہوچکے ہیں تو اولاً تو اس میں کامیابی نہیں ہوسکتی، دوسرے خود سیاسی جماعتیں ہی یہ حالات پیدا کرنے کی اصلی گنہگار ہیں، ان سب نے ناپسندیدہ عناصر کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے ہیں اگر غلط کار اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے لیے نہ بھی منتخب ہوں تو اپنی اپنی پارٹیوں کے زیر سایہ اور ان کے پرچم تلے رہ کر بھی مسلسل گل کھلاتے رہیں گے۔

سبک دوش صدر جمہوریہ ڈاکٹر عبدالکلام نے نہایت درد بھرے اپنے آخری خطاب میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بہت قابل غور ہے کہ اگر حکومت بدعنوانیوں سے پاک، شفاف اور متحرک ہو تو ہندوستان ۲۰۲۰ء تک ترقی یافتہ ملک بننے کے مشن میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے، ملک کے ۵۴ کروڑ نوجوان اپنے ذہن اور دل کو پرسوز بنائیں اور بلند عزائم کے لیے جاں فشانی کے ساتھ جدوجہد کریں، ملک کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے دیہی اور شہری فاصلے کم سے کم کیے جائیں، وسائل کی مساوی تقسیم ہو، توانائی کے ذرائع تک سب کی مناسب رسائی ہو، صاف پانی، زراعت، صنعت اور دیگر خدمات کے شعبوں میں ہم آہنگی ہو اور نوجوانوں کے لیے اقدار پر مبنی اعلا تعلیم فراہم کی جائے، سماجی یا معاشی بنیادوں پر ذہین طلبہ کو اعلا تعلیم دلانے میں امتیاز نہ برتا جائے، کیوں کہ یہی ملک کی اصل دولت ہیں، انہوں نے ترقی یافتہ ہندوستان کو ایک ایسی قوم بن جانے پر زور دیا، جہاں صحت کی نگہ داشت کی سہولتیں تمام شہریوں کے لیے میسر ہوں، حکومت شفاف، بدعنوانیوں سے پاک اور شہریوں کے تئیں فکر مند اور متحرک ہو، تاکہ غربت اور ناخواندگی کا مکمل خاتمہ ہو، خواتین اور بچوں کے خلاف جرائم نہ ہوں اور سماج کا کوئی بھی طبقہ اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس نہ کرے، اسی طرح ملک، مثالی اور معیاری، ترقی یافتہ، خوش حال، صحت مند، محفوظ اور پرامن رہ سکتا ہے اور اس کی پایدار ترقی کی رفتار جاری رہ سکتی ہے، ایسے ہی بہترین علاقے میں رہائش اختیار کرنا اور زندگی گزارنا انسان کے لیے قابل فخر ہوسکتا ہے، ملک کے ہر شخص کو غور کرنا چاہیے کہ کیا ایسے بہترین اور مثالی ہندوستان کی تعمیر میں ملک کی قیادت، سیاسی رہنما، مختلف گروہ، تمام طبقے اور سارے لوگ سرگرم عمل ہیں؟

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی مسلمانوں کا بڑا قیمتی اثاثہ ہے، اس پر کوئی آنچ آتی ہے تو وہ بجا طور سے تڑپ اٹھتے ہیں، یہ عملاً ایک اقلیتی ادارہ ہے اور اس کا نظم ونسق مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، جس میں حکومت

کی بیجامداخلت ان کو پسند نہیں ہے،لیکن یونی ورسٹی سے وابستہ حضرات اس پر کیوں نہیں غور کرتے کہ خود ان کے رویے سے بھی تو یونی ورسٹی کو سخت نقصان پہنچتا ہے اور وہ بھی اس کی رسوائی اور فضیحت کا سبب بنتے ہیں، وہاں جو بدنما واقعات پیش آتے ہیں،کہا جاتا ہے کہ ان میں ان کی باہمی رقابت اور سازش کا دخل ہوتا ہے، یہ کس قدر اذیت ناک امر ہے کہ چند مہینوں میں یونی ورسٹی کیمپس میں تین قتل ہوئے، آخری قتل رمضان کے مقدس مہینے میں ہوا جو اور زیادہ شرم ناک ہے،اس کے بعد مشتعل طلبا نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر وی سی لاج اور دفتر میں جو توڑ پھوڑ،تشدد اور آتش زنی کی،کیا ایسی ناروا حرکت کرنے والے یونی ورسٹی کے ہم درد ہو سکتے ہیں،ایکزیکیٹو کونسل کی میٹنگ میں ہوسٹلوں میں ناپسندیدہ لوگوں کے رہنے کو اس کی وجہ بتائی گئی ہے مگر یہ تو انتظامی خرابی اور کم زوری کا نتیجہ ہے،بہر حال بہت جلد اصل اسباب کا پتا چلا کر قصور واروں کو عبرت ناک سزا دینا ضروری ہے،یونی ورسٹی بند کرنا مسئلے کا حل نہیں،اس سے دور دراز کے طلبا خصوصاً طالبات کو بڑی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔

جناب محمد شفیع قریشی ملک کے تجربہ کار سیاست داں ہیں،وہ جموں وکشمیر پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر،مرکزی وزیر اور مدھیہ پردیش وغیرہ کے گورنر بھی رہے ہیں،اب پھر یو۔پی اے حکومت کی نظر ان پر پڑی اور انہیں جناب محمد حامد انصاری کی جگہ جو ملک کے نائب صدر جمہوریہ ہوگئے ہیں قومی اقلیتی کمیشن کا چیرمین مقرر کیا گیا ہے،ہم دونوں حضرات کو مبارک باد پیش کرتے ہیں،قریشی صاحب کی اولین ترجیح یہ ہوگی کہ اقلیتوں سے متعلق رپورٹوں کو عملی جامہ پہنائیں،سچر کمیٹی کی رپورٹ کو بہت جامع قرار دیتے ہوئے کہا کہ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سفارشات پر کس طرح موثر طریقے سے عمل کیا جائے، انہوں نے اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ کہی کہ کمیٹیاں اور کمیشن قائم کرنا اور ان سے رپورٹیں طلب کرنا فضول بات ہے،اصل کام تو یہ ہے کہ کمیشنوں اور کمیٹیوں کی سفارشات پر عمل بھی کیا جائے، مسلمانوں کے سلسلے کی رپورٹوں اور سفارشات کا حشر سب کے سامنے ہے،ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ ممبئی فسادات کے بعد جسٹس سری کرشنا کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ بی جے پی اور شیوسینا جیسی فرقہ پرست پارٹیوں کی حکومت کا جو رویہ تھا،وہی رویہ کانگریس اور نیشنلسٹ کانگریس جیسی سیکلر پارٹیوں کا بھی ہے،شفیع صاحب کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ ان ناانصافیوں کی تلافی اور سچر کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کرانے میں ضرور دل چسپی لیں گے،پر خلوص کوشش ہی کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مقالات

مولانا روم، مولانا شبلی کی نظر میں☆

از:- ضیاء الدین اصلاحی

مولانا شبلی اردو کے بڑے مصنفین میں تھے،ان کی مختلف النوع تصنیفات بلند پایہ اور مہتم بالشان ہیں،الفاروق پر ان کو خود بہ جا طور سے فخر تھا اور سیرۃ النبی تو اپنی مثال آپ ہے،ان کی دوسری تصنیفات بھی اردو کے علمی،ادبی اور تحقیقی ذخیرے میں قیمتی اضافہ ہیں۔

اس وقت ہمارا موضوع سخن سوانح مولانا روم ہے جو مولانا شبلی کے سلسلۂ کلامیہ کی تصانیف میں داخل اور اس کا چوتھا نمبر ہے،پہلے تین حصے اس طرح ہیں علم الکلام،الکلام،الغزالی، مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے وہ فقر و تصوف ہے اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلے میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا لوگوں کو موجب تعجب ہوگا لیکن ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بہ خود دل نشین ہوجائیں،مولانا روم نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے،مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے اس لئے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے۔(۱)

دوسری جگہ مثنوی کے متعلق حیرت و استعجاب سے لکھا ہے کہ ”اس قدر مقبول ہونے اور

☆ یہ مقالہ کولکتا کی ایران سوسائٹی کے مولانا جلال الدین رومی پر ۲۷-۲۵/اگست ۲۰۰۷ء کو ہونے والے بین الاقوامی سمینار میں پڑھا گیا تھا۔

---

(۱) سوانح مولانا روم (دیباچہ) ص ۳،ایڈیشن ۲۰۰۳ء،معارف پریس اعظم گڈھ۔

ہزاروں لاکھوں دفعہ پڑھے جانے کے بعد بھی لوگ اس کو جس حیثیت سے جانتے ہیں، وہ صرف یہ ہے کہ وہ تصوف اور طریقت کی کتاب ہے، یہ کسی کو خیال بھی نہیں آیا کہ وہ صرف تصوف نہیں بلکہ عقائد اور علم کلام کی بھی عمدہ ترین تصنیف ہے، .... اس (امام رازی کے) وقت سے آج تک سینکڑوں ہزاروں کتابیں (علم کلام میں) لکھی جا چکیں، یہ سارا دفتر ہمارے سامنے ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ مسائلِ عقائد جس خوبی سے مثنوی میں ثابت کیے گئے ہیں، یہ تمام دفتر اس کے آگے ہیچ ہے"۔(۱)

حبیبِ شبلی مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی مرحوم کا بھی خیال ہے کہ:

"مثنوی شریف کو ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے پڑھا ہوگا، اس کی بیسوں شرحیں لکھی گئیں، بہت سے خلاصے ہوئے لیکن جہاں تک معلوم ہے، صرف ایک تصوف کی کتاب کی حیثیت سے، یہ دقیقہ سنجی علامہ شبلی کی نظر کے واسطے ودیعت تھی کہ مثنوی معنوی علم کلام کا بھی بہترین مجموعہ ہے"۔(۲)

سوانح مولانا روم کے مشمولات: مولانا روم کے متعلق مولانا شبلی کے اس منفرد نقطہ نظر کا ذکر کر کے ہم ان کی تصنیف سوانح مولانا روم کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لے کر یہ دکھائیں گے کہ انہوں نے مولانا روم کے بارے میں کیا اطلاعات اور معلومات فراہم کی ہیں اور مثنوی کی روشنی میں انہوں نے مولانا کے کن افکار و خیالات کی نشان دہی کی ہے، اسی ضمن میں ان کے متکلمانہ افکار بھی زیر بحث آئیں گے۔

سوانح مولانا روم کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں مولانا کے حالات و سوانح جو بہت کم ملتے ہیں، تلاش و تفحص سے لکھے گئے ہیں، اس میں پہلے مولانا کا نام، خاندان، ولادت اور ان کی تعلیم و تربیت کا ذکر ہے، پھر ان کے سلسلۂ باطنی، اولاد اور اخلاق و عادات کا تذکرہ ہے۔

دوسرے حصے میں مولانا کی تصنیفات کو موضوع بحث بنایا ہے جو تین ہیں:

۱-فیہ مافیہ: یہ خطوط کا مجموعہ ہے، ۲-دیوان، ۳-مثنوی۔

اس حصے میں دیوان اور مثنوی پر پہلے مجمل اور اخیر میں مفصل تبصرہ ہے، پہلے حصے میں

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۸۱ (۲) حیات شبلی، ص ۳۷۶، طبع چہارم، معارف پریس اعظم گڈھ۔

مولانا شبلی کی مورخانہ اور محققانہ اور دوسرے حصے میں ان کی ناقدانہ اور متکلمانہ شان جلوہ گر ہے، پہلے حصے میں یہ امور قابل ذکر معلوم ہوتے ہیں:

۱-مولانا شبلی دراصل ایک مورخ تھے اور مورخ کا فرض یہ ہے کہ وہ واقعات کی اصلی اور صحیح تصویر پیش کرے، چنانچہ جب وہ مولانا روم کی تمام علوم درسیہ میں اعلا درجے کی مہارت کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ انہوں نے کس قسم کے علوم درسیہ میں کمال حاصل کیا تھا، مولانا شبلی رقم طراز ہیں:

انہوں نے جو کچھ پڑھا تھا اور جن چیزوں میں کمال حاصل کیا تھا وہ اشاعرہ کے علوم تھے، مثنوی میں جو تفسیری روایتیں نقل کی ہیں، اشاعرہ یا ظاہریوں کی روایتیں ہیں، انبیاؑ کے قصص وہی نقل کیے ہیں جو عوام میں مشہور تھے، معتزلہ سے ان کو وہی نفرت ہے، جو اشاعرہ کو ہے، چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہست ایں تاویلِ اہلِ اعتزال   وائے آں کس کو نہ دارد نور حال(۱)

جو روایتیں خلاف قیاس اور صحت سے دور ہوں مورخ و محقق ان کو قبول نہیں کرتا، مولانا شبلی نے شمس تبریز سے مولانا روم کی ملاقات کے سلسلے میں لکھا ہے:

"یہ عجیب بات ہے کہ شمس تبریز کی ملاقات کا واقعہ جو مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ ہے، تذکروں اور تاریخوں میں اس قدر مختلف اور متناقض طریقوں سے منقول ہے کہ اصل واقعہ کا پتا لگانا مشکل ہے"۔(۲)

پھر کئی روایتیں نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں:

"جو روایتیں نقل ہوئیں ان میں سے بعض نہایت مستند کتابوں میں ہیں (مثلاً جواہر مضیئہ) بعض اور تذکروں میں منقول ہیں، بعض زبانی متواتر روایتیں ہیں لیکن ایک بھی صحیح نہیں، نہ صرف اس لحاظ سے کہ خارج از قیاس ہیں بلکہ اس لیے کہ جیسا کہ آگے آتا ہے صحیح روایت کے خلاف ہیں، اس سے تم قیاس کر سکتے ہو کہ صوفیائے کبار کے حالات میں کس قدر دور از کار روایتیں مشہور ہو جاتی ہیں اور وہی کتابوں میں درج ہو کر سلسلہ بہ سلسلہ پھیلتی جاتی ہیں"۔(۳)

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۶، ایڈیشن ۲۰۰۳ء، معارف پریس اعظم گڈھ (۲) ایضاً، ص ۶ و ۷ (۳) ایضاً، ص ۸ و ۹۔

مولانا شبلی کے نزدیک دونوں کی ملاقات کی جو روایت صحیح ہے، اس کے صحیح ہونے کی وجہ یہ ہے:

"سپہ سالار مولانا کے خاص شاگرد تھے، ۴۰ برس فیض صحبت اٹھایا تھا، واقعہ نگاری میں ہر جگہ خرق عادت کی آمیزش بھی کرتے جاتے ہیں، تاہم شمس کی ملاقات کا جو حال لکھا ہے، سادہ، صاف اور بالکل قرین عقل ہے"۔(۱)

مولانا روم کے زمانے میں ہلاکو خاں کے سپہ سالار بیچو خاں نے قونیہ پر حملہ کیا اور اپنی فوجیں شہر کے چاروں طرف پھیلا دیں، اہل شہر محاصرہ سے تنگ آکر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ایک ٹیلہ پر جو بیچو خاں کے خیمہ گاہ کے سامنے تھا مصلاً بچھا دیا اور نماز پڑھنا شروع کی، بیچو خاں کے سپاہیوں نے مولانا کو تاک کر تیر باراں کرنا چاہا لیکن کمانیں کھنچ نہ سکیں، آخر گھوڑے بڑھائے کہ تلوار سے قتل کر دیں لیکن گھوڑے جگہ سے ہل نہ سکے، تمام شہر میں غل پڑ گیا، لوگوں نے بیچو خاں سے جا کر یہ واقعہ بیان کیا، اس نے خود خیمہ سے نکل کر کئی تیر چلائے لیکن سب پھٹ پھٹ کر ادھر ادھر نکل گئے، جھلا کر گھوڑے سے اتر پڑا اور مولانا کی طرف چلا لیکن پاؤں اٹھ نہ سکے آخر محاصرہ چھوڑ کر چلا گیا۔(۲)

مولانا شبلی اس پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ پوری روایت مناقب العارفین میں ہے (ص ۱۵۳) صوفیانہ روایتوں پر خوش اعتقادی کے حاشیے خود بہ خود چڑھتے جاتے ہیں، اس لیے اگر ان کو الگ کر دیا جائے تو واقعہ اس قدر نکلے گا کہ مولانا نے جب اطمینان، استقلال اور بے پروائی سے عین بیچو خاں کے خیمہ کے آگے مصلاً بچھا کر نماز پڑھنی شروع کی ہوگی اور اہل فوج کی تیر باراں کا کچھ خیال نہ کیا ہوگا تو اس نے خود بیچو خاں کے دل کو مرعوب کر دیا ہوگا اور اس قسم کے واقعات کثرت سے پائے جاتے ہیں"۔(۳)

مولانا روم کے سلسلۂ باطنی کے ضمن میں ان کی جانب منسوب فرقہ جلالیہ کا ذکر مولانا شبلی نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے روم کے سفر کے زمانے میں اس فرقے کے اکثر جلسے

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۹، ایڈیشن ۲۰۰۳ء، معارف پریس اعظم گڈھ (۲) ایضاً، ص ۱۴ و ۱۵ (۳) ایضاً، ص ۱۵۔

دیکھے ہیں، ذکر و شغل کا یہ طریقہ ہے کہ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں، ایک شخص کھڑا ہو کر ایک ہاتھ سینہ پر اور ایک ہاتھ پھیلائے ہوئے رقص شروع کرتا ہے، رقص میں آگے یا پیچھے بڑھنا یا ہٹنا نہیں ہوتا بلکہ ایک جگہ جم کر متصل چکر لگاتے ہیں، اس پر یہ نقد کیا ہے کہ چوں کہ مولانا پر ہمیشہ ایک وجد اور سکر کی حالت طاری رہتی تھی اور جیسا کہ آگے آئے گا اور اکثر جوش کی حالت میں ناچنے لگتے تھے، مریدوں نے تقلیداً اس طریقہ کو اختیار کیا، حالاں کہ یہ ایک غیر اختیاری کیفیت تھی جو تقلید کی چیز نہیں۔(۱)

مولانا شبلی ایک دیدہ ور مورخ تھے، اسلامی دور کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی، مولانا روم کے زمانے میں تاتار کا سیلاب امنڈ پڑا اور سارے عالم اسلام کو تاراج کر دیا، اس اجڑے ہوئے دور میں دنیائے اسلام ارباب کمال سے معمور تھی، گو سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا مگر علم کا تخت و تاج بے رونق نہیں ہوا تھا، اس نکتہ کو ان ہی کے لفظوں میں ملاحظہ کیجیے:

"اسلام کو آج تیرہ سو برس ہوئے اور اس مدت میں اس نے بار بار بڑے بڑے صدمات اٹھائے لیکن ساتویں صدی میں جس زور کی اس کو ٹکر لگی کسی اور قوم یا مذہب کو لگی ہوتی تو پاش پاش ہو کر رہ جاتا، یہی زمانہ ہے جس میں تاتار کا سیلاب اٹھا اور دفعتاً اس سرے سے اس سرے تک پھیل گیا، سینکڑوں ہزاروں اجڑ گئے، کم از کم ۹۰ لاکھ آدمی قتل کر دیے گئے، سب سے بڑھ کر یہ کہ بغداد جو تارک اسلام کا تاج تھا، اس طرح برباد ہوا کہ آج تک سنبھل نہ سکا، یہ سیلاب ۶۱۵ھ میں تاتار سے اٹھا اور ساتویں صدی کے اخیر تک برابر بڑھتا گیا، یہ سب کچھ ہوا لیکن اسلام کا علمی دربار اسی اوج و شان کے ساتھ قائم رہا، محقق طوسی، شیخ سعدی، خواجہ فریدالدین عطار، عراقی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ محی الدین عربی، صدرالدین قونوی، یاقوت حموی، ابن الاثیر مورخ، ابن الفارض، شاذلی، عبداللطیف بغدادی، نجم الدین رازی، سکاکی، سیف الدین آمدی، شمس الائمہ کردری، محدث ابن صلاح، ابن النجار مورخ بغداد، ضیاء ابن بیطار، ابن حاجب، ابن القفطی صاحب تاریخ الحکما، خونجی منطقی، شاہ بوعلی قلندر، زملکانی وغیرہ اسی پرآشوب عہد کے یادگار ہیں"۔(۲)

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۲۲، ایڈیشن ۲۰۰۳ء، معارف پریس اعظم گڈھ (۲) ایضاً، ص ۲۳۔

تصنیفات کے حصے میں دیوان کے اجمالی تبصرے میں پہلی قابل ذکر بات یہ لکھی ہے کہ مولانا کے دیوان میں قریباً ۵۰ ہزار اشعار ہیں، اس سلسلے میں دوسری اہم بات جو لکھا ہے، اس میں مولانا شبلی کا تحقیقی رنگ نمایاں ہے، وہ بتاتے ہیں کہ چوں کہ غزلوں کے مقطع میں عموماً شمس تبریز کا نام ہے، اس لیے عوام مولانا روم کے دیوان کو شمس تبریز ہی کا دیوان سمجھتے ہیں، چنانچہ دیوانِ مطبوعہ کی لوح پر شمس تبریز ہی کا نام لکھا ہے لیکن مولانا شبلی کے نزدیک یہ فاش غلطی ہے اور اس کی وجہیں یہ ہیں:

۱- شمس تبریز کا نام تمام غزلوں میں اس حیثیت سے آیا ہے کہ مرید اپنے پیر سے خطاب کررہا ہے یا غائبانہ اس کے اوصاف بیان کرتا ہے۔

۲- ریاض العارفین وغیرہ میں تصریح کی ہے کہ مولانا روم نے شمس تبریز کے نام سے یہ دیوان لکھا ہے۔

۳- اکثر شعرا نے مولانا روم کی غزلوں پر جو غزلیں لکھی ہیں ان کے مقطع میں تصریح کی ہے کہ یہ غزل مولانا کی غزل کے جواب میں ہے، اس کے ساتھ مولانا کی غزل کا پورا مصرعہ یا کوئی ٹکڑا اپنی غزل میں لے لیا ہے، یہ وہی غزلیں ہیں جو مولانا کے اسی دیوان میں ملتی ہیں جو شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے، مثلاً علی حزیں کہتے ہیں:

ایں جوابِ غزل مرشد روم ست کہ گفت   من بہ بوے تو خوشم نافۂ تاتاری گر

دوسرا مصرعہ مولانا روم کا ہے چنانچہ پورا شعر یہ ہے:

من بہ کوے تو خوشم خانۂ من ویراں کن   من بہ بوے تو خوشم نافۂ تاتاری گر

حزیں کی ایک اور غزل کا شعر ہے:

مطرب ز نوائے عارف روم   ایں پردہ بزن ، کہ "یار دیدم" (۱)

تفصیلی تبصرے میں دیوان کے متعلق مولانا شبلی کی قابل ذکر اطلاعات یہ ہیں:

۱- دیوان میں صرف غزلیں ہیں، قصیدہ یا قطعہ وغیرہ مطلق نہیں۔

۲- مولانا روم کی شاعری کا دامن مدح کے داغ سے بالکل پاک ہے حالاں کہ ان کے

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۳۵ و ۳۶، ایڈیشن ۲۰۰۳ء، معارف پریس اعظم گڈھ۔

معاصرین میں سے عراقی اور سعدی تک جو ارباب حال میں نام ور ہیں، اس عیب سے نہ بچ سکے۔

۳- مولانا روم کے زمانے تک غزل نے کسی قسم کی ترقی نہیں کی تھی۔ (۱)

۴- غزل دراصل سوز و گداز کا نام ہے، مولانا روم کے زمانے تک جو لوگ شعر و شاعری میں مشغول تھے، انہوں نے معاش کی ضرورت سے اس فن کو پیشہ بنایا تھا، عشق و عاشقی سے ان کو سروکار نہ تھا، ان کے کلام میں صنائع لفظی اور الفاظ کی مرصع کاری کے سوا جوش اور اثر نام کو بھی نہیں پایا جاتا، انوری، خاقانی، عبدالواسع جبلی، مسعود سعد سلمان کی غزلیں آج بھی موجود ہیں، ان میں سوز و گداز کا پتا تک نہیں۔ (۲)

۵- ایران کی شاعری میں درد و اثر کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ارباب حال یعنی حضرات صوفیہ میں بعض بالطبع شاعر تھے، عشق و محبت کا سرمایہ ان کو تصوف سے ملا، ان دونوں کے اجتماع نے ان کے کلام میں جوش اور اثر پیدا کیا، سلطان ابوسعید ابوالخیر، حکیم سنائی، خواجہ فریدالدین عطار اس خصوصیت کے موجد اور بانی ہیں لیکن ان حضرات نے درد دل کا اظہار زیادہ تر رباعیات، قصائد اور مثنویات کے ذریعہ سے کیا تھا۔ (۳)

۶- غزلیں اب تک سادگی کی حالت میں رہیں، ساتویں صدی ہجری میں دولت سلجوقیہ کے فنا ہونے سے صلہ گستری اور فیاضی کا بازار سرد ہو چکا تھا، اس لیے شعرا کی طبیعتوں کا زور قصائد سے ہٹ کر غزل کی طرف متوجہ ہوا، ان میں سے بعض فطری عاشق مزاج تھے، اس لیے ان کے کلام میں خود بہ خود وہ بات پیدا ہوگئی جو غزل کی جان ہے۔ (۴)

۷- جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا، وہ شیخ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔ (۵)

۸- غزل کی ترقی دینے والوں کی فہرست سے مولانا کا نام خارج نہیں کیا جاسکتا لیکن انصاف یہ ہے کہ غزل گوئی کی حیثیت سے مولانا کا سعدی اور عراقی سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، سپہ سالار نے مولانا روم کے حوالے سے لکھا ہے "از بیم آں کہ ملول نہ شوند شعری گویم، واللہ کہ من از شعر بیزارم، در ولایت ما و قوم از شاعری ننگ تر کارے نہ بود" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے بہ جبر شاعری کا شغل اختیار کیا تھا، ان کے وطن بلخ میں یہ فن نہایت ذلیل سمجھا جاتا تھا لیکن چوں کہ

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۳۷، (۲) ایضاً، ص ۳۷ و ۳۸، (۳) ایضاً، ص ۳۸ (۴) ایضاً (۵) ایضاً، ص ۳۸ و ۳۹۔

ان ممالک میں شعر کے بغیر لوگوں کو دل چسپی نہیں ہوتی، اس لیے مجبوراً یہ شغل اختیار کیا ہے۔(۱)

۹-غزل کے خاص مضامین، الفاظ اور ترکیبیں مقرر ہیں، اس کو اپنا فن قرار دینے والے کسی حالت میں اس محدود دائرے سے نہیں نکلتے، بہ خلاف اس کے مولانا (روم) اس کے مطلق پابند نہیں، وہ ان غریب اور ثقیل الفاظ تک کو بے تکلف استعمال کرتے ہیں جو غزل کیا قصیدہ میں بھی لوگوں کے نزدیک بار پانے کے قابل نہیں۔(۲)

۱۰-غزل کی عام مقبولیت اور دل آویزی کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس میں مجاز کا پہلو غالب رکھا جائے اور اس قسم کے حالات اور معاملات بیان کیے جائیں جو ہوس پیشہ عشاق کو اکثر پیش آیا کرتے ہیں، مولانا کے کلام میں حقیقت کا پہلو اس قدر غالب ہے کہ رندوں اور ہوس بازوں کو جو غزل کی اشاعت و ترویج کے نقیب ہیں، اپنے مذاق کے موافق بہت کم سامان ہاتھ آتا ہے۔(۳)

۱۱-فکِ اضافت جو شاعری کی شریعت میں ابغض المباحات ہے، اس کو مولانا اس کثرت سے برتتے ہیں کہ جی گھبرا جاتا ہے(۴)، مثنوی پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی اسے گناہ صغیرہ کہا ہے۔(۵)

غزل کی خصوصیات: مولانا شبلی نے مولانا روم کی غزلوں کی مندرجہ ذیل خصوصیات بیان کی ہیں:

۱-اکثر غزلیں کسی خاص حالت میں لکھی گئی ہیں، اس وجہ سے ان میں ایک ہی حالت کا بیان چلا جاتا ہے، عام غزلوں کی طرح ہر شعر الگ نہیں ہوتا، مثلاً ان کی ایک خاص حالت یہ تھی کہ جوش و مستی میں اکثر رات رات بھر جاگا کرتے تھے، اس کو ایک غزل میں اس طرح ادا کیا ہے:

دیدہ خوں گشت و خوں نہ می خسپد — دلِ من از جنوں نہ می خسپد
مرغ و ماہی ز من شدہ حیران — کایں شب و روز چوں نہ می خسپد
پیش ازیں در عجب ہمی بودم — کآسمانِ نگوں نہ می خسپد
آسمان خود کنوں ز من خیرہ است — کہ چرا ایں زبوں نہ می خسپد
عشق بر من فسوں اعظم خواند — دل شنید آں فسوں نہ می خسپد(۶)

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۳۸، ۳۹ (۲) ایضاً ۳۹ (۳) ایضاً (۴) ایضاً، ص ۳۹ (۵) ایضاً، ص ۶۰ (۶) ایضاً، ص ۴۰۔

نماز میں مولانا روم پر جو بے خودی طاری ہوتی تھی، اس کو ایک غزل میں ادا کیا ہے، اس کے ایک شعر

خدا خبر نہ دارم چو نماز می گزارم — کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

کے متعلق مولانا شبلی نے لکھا ہے" اس کی سادگی اور واقعہ کی تصویر خاص توجہ کے قابل ہے۔(۱)
توحید کی حقیقت میں اکثر مسلسل غزلیں کہی ہیں۔

۲-مولانا روم کے کلام میں جو وجد، جوش اور بے خودی پائی جاتی ہے وہ اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی، وہ فطرتاً پرجوش طبیعت رکھتے تھے، شمس تبریز کی صحبت نے اس نشہ کو اور تیز کر دیا، ایک موقع پر ان کے دل میں جذبۂ محبت سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ محبوب مجھ سے اس قدر کھنچتا اور دامن بچاتا ہے لیکن اگر بہ جائے اس کے میں محبوب اور میرے بہ جائے محبوب مجھ پر عاشق ہوتا تو میں ہرگز اس طرح رکھائی سے پیش نہ آتا بلکہ عاشق کی قدر دانی کرتا اور اس کی تمام آرزوؤں کو برلاتا۔(۲)

۳-مولانا شبلی کے نزدیک مولانا روم کے کلام کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عشق اور محبت کے جوش میں عاشق پر جو خاص حالتیں گزرتی ہیں، ان کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر کھنچ جاتی ہے اور یہ شاعری کا سب سے بڑا کمال ہے، مثلاً کبھی کبھی عاشق کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ معشوق کو یوں ہماری بے تابی اور جگر سوزی کی قدر نہ ہوگی، جب تک وہ خود بھی کسی پر عاشق نہ ہو اور اس کو بھی اس قسم کے معاملات پیش نہ آئیں، اس حالت کو مولانا روم اس طرح بیان کرتے ہیں:

اے خداوند یکے یار جفا کارش دہ — دلبرِ عشوہ گرِ سرکش و خوں خوارش دہ
چند روزے ز پئے تجربہ، بیمارش کن — با طبیبانِ دغا پیشہ سروکارش دہ
تا بداند کہ شبِ ما بہ چساں می گزرد — دردِ عشقش دہ و عشقش دہ و بسیارش دہ(۳)

۴-تصوف کے دو مقام آپس میں متقابل ہیں، فنا و بقا، مقام فنا میں سالک پر خضوع، مسکینی اور انکسار کی کیفیت غالب ہوتی ہے، بہ خلاف اس کے بقا میں سالک کی حالت جلال اور

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۴۰ (۲) ایضاً (۳) ایضاً، ص ۴۲۔

عظمت سے لبریز ہوتی ہے، مولانا پر یہ حالت زیادہ غالب رہتی تھی، اس لیے ان کے کلام میں جو جلال، ادعا، بے باکی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے، صوفیہ میں سے کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی، مرزا غالب مولانا کے ایک شعر پر جو بقا کی حالت کا ہے سر دھنا کرتے تھے، وہ شعر یہ ہے:

بہ زیر کنگرۂ کبریاش مردانند   فرشتہ صید، و پیمبر شکار، و یزداں گیر (۱)

اس قسم کے اور بہت سے اشعار ہیں:

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم   چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
بہ نمود می نشانے ز جمال او و لیکن   دو جہاں بہم برآید سر شور و شر نہ دارم
حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست   خام بدم - پختہ شدم - سوختم (۲)
ما دل اندر راہِ جاں انداختیم   غلغلے اندر جہاں انداختیم
من ز قرآں برگزیدم مغز را   پوست را پیش سگاں انداختیم
تخم اقبال و سعادت تا ابد   از زمیں تا آسماں انداختیم
جبۂ و دستار و علم و قیل و قال   جملہ در آب رواں انداختیم
از کمالِ شوق تیر معرفت   راست کردہ بر نشاں انداختیم (۳)

تبصرے کے اخیر میں مولانا شبلی نے مولانا روم کے دیوان سے چند اشعار انتخاب کیے ہیں، بعض اشعار ملاحظہ ہوں:

آئینۂ خریدۂ می نگری جمال خود   در پسِ پردہ رفتۂ پردۂ ما دریدۂ
بروید اے حریفاں! بکشید یار ما را   بہ من آورید حالا صنمِ گریز پارا
اگر او بہ وعدہ گوید کہ دمِ دگر بیاید   مخورید مکر او را بہ فریبد او شمارا
ور بہ اول روز ازیں حال آگہی بودی مرا   در تو کے دل بستمی گر تو بستمی ببریدمی
ور بہ خوبی چوں گل روی تو بودی خوئے تو   ای بسا گلہا کہ من از باغ وصلت چیدمی
از رخ و لب گل شکر بسیار دارد حسن تو   کاشکے بفروختی تا پارۂ بخریدمی
در مذہب عاشقاں قرارے دگرست   ویں بادۂ ناب را خمارے دگرست

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۴۲ و ۴۳ (۲) ایضاً، ص ۴۳ (۳) ایضاً، ص ۴۳ و ۴۴۔

ہر علم کہ در مدرسہ حاصل کردیم   کارے دگرست، وعشق کارے دگرست
گریم زغم تو زار و گوئی زرق ست   چوں زرق بود کہ دیدہ درخون غرق ست
تو پنداری تمام دلہا دل تست   نے نے صنما! میانِ دلہا فرق ست

مولانا شبلی کے انتخاب میں یہ شعر بھی شامل ہے:

ای بلبلِ سحر گہ، ما را بہ پرس گہ گہ   آخر تو ہم غریبی، ہم از دیار مائی

اور لکھا ہے کہ خواجہ حافظ نے اسی مضمون کو ترقی دے کر کہا ہے:

بنال بلبل اگر با منت سر یاری ست   کہ ما دو عاشقِ زاریم و کار ما زاری ست (۱)

مثنوی کے اجمالی تبصرے کی یہ باتیں قابل ذکر ہیں:

۱- یہی وہ کتاب ہے جس نے مولانا روم کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہے اور جس کی شہرت نے ایران کی تمام تصنیفات کو دبا لیا ہے (۲)۔ (مثنوی کی شہرت و مقبولیت کا مزید ذکر تفصیلی تبصرہ میں آئے گا)

۲- کشف الظنون کے حوالے سے مولانا شبلی نے مثنوی کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۶۶۶۰ لکھی ہے۔ (۳)

۳- مشہور یہ ہے کہ مولانا روم نے چھٹا دفتر ناتمام چھوڑا تھا اور فرما دیا تھا کہ

باقی ایں گفتہ آید بے گماں   در دلِ ہر کس کہ باشد نور جاں

تکمیل کے لیے اکثروں نے کوششیں کیں اور مولانا سے جو حصہ رہ گیا تھا، اس کو پورا کیا مگر مولانا شبلی کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے بیماری سے نجات پا کر خود اس حصہ کو پورا کیا تھا اور ساتواں دفتر لکھا تھا، جس کا مطلع یہ ہے:

اے ضیاء الحق حسام الدین سعید   دولت پایندہ عمرت بر مزید

شیخ اسماعیل قیصری نے مثنوی کی بڑی ضخیم شرح لکھی ہے، ان کو اس دفتر کا ایک نسخہ ۸۱۴ھ کا لکھا ہوا ہاتھ آیا، انہوں نے تحقیق اور تنقید کی تو ثابت ہوا کہ خود مولانا کی تصنیف ہے مگر ارباب طریقت نے مخالفت کی اور اس کی صحت پر بہت سے شبہات وارد کیے، اسماعیل نے ان

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۴۵ و ۴۶ (۲) ایضاً، ص ۳۶ (۳) ایضاً۔

تمام اعتراضات کا تفصیلی جواب لکھا، صاحب دیباچہ نے لکھا ہے کہ اب تمام شام و روم میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ دفتر بھی مولانا ہی کے نتائج طبع سے ہے۔(۱)

تفصیلی تبصرے میں مولانا روم کے افکار و خیالات کی بحث و وضاحت سے قبل مولانا شبلی نے یہ بتایا ہے کہ مثنوی نگاری کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ آل سامان اور سلطان محمود کو اپنے آبا و اجداد (شاہان عجم) کے کارنامے کو نظم میں ادا کیے جانے کا ذوق پیدا ہوا، اس کے نتیجے میں مثنوی ایجاد ہوئی جو واقعات تاریخ کے ادا کرنے کے لئے اصناف نظم میں سب سے بہتر صنف ہے۔(۲)

مثنوی کو فردوسی نے اس قدر ترقی دی کہ آج تک اس پر اضافہ نہ ہو سکا لیکن مثنوی بلکہ کل اصناف شاعری کی ترقی اس وقت تک واقعہ نگاری اور خیال بندی و صنائع و بدائع کے لحاظ سے ہوئی تھی، سلطان ابوسعید ابوالخیر نے رباعی میں تصوف اور طریقت کے خیالات ادا کیے، اس سے فارسی شاعری میں ذوق و کیفیت کا وجود ہوا اور وجد و مستی کی روح آئی، دولت غزنویہ کے اخیر زمانے میں حکیم سنائی نے حدیقہ لکھی جو نظم میں تصوف کی پہلی تصنیف تھی، پھر خواجہ فرید الدین عطار نے متعدد مثنویاں لکھیں جن میں سے مثنوی منطق الطیر نے زیادہ شہرت حاصل کی، مثنوی مولانا روم اس سلسلے کی خاتم ہے، اس امر کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ خواجہ عطار کی تصنیفات مولانا کے لئے دلیل راہ بنیں۔(۳)

حسام الدین چلپی نے مولانا سے منطق الطیر کے طرز پر مثنوی لکھنے کی فرمائش کی، مولانا نے فرمایا مجھ کو بھی رات یہ خیال آیا اور اسی وقت یہ چند شعر موزوں ہوئے ع بشنو از نے چوں حکایت می کند الخ

مثنوی کی تصنیف میں حسام الدین چلپی کو بہت دخل ہے اور درحقیقت یہ نایاب کتاب ان ہی کی بہ دولت وجود میں آئی، وہ مولانا کے مریدان خاص میں سے تھے اور مولانا اس قدر ان کی عزت کرتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ پیر طریقت اور استاد کا ذکر ہے، بہ جز دفتر اول کے ہر دفتر ان کے نام سے مزین ہے، پہلا دفتر تمام ہوا تو حسام الدین چلپی کی بیوی نے انتقال کیا، اس سے ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ دو برس تک افسردہ رہے، مثنوی کے وہی محرک تھے، مولانا بھی دو برس

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۳۶ و ۳۷ (۲) ایضاً، ص ۴۶ (۳) ایضاً، ص ۴۷

تک چپ رہے، آخر جب خود حسام الدین نے استدعا کی تو پھر مولانا کی زبان کھلی، دوسرے دفتر کے آغاز کی تاریخ ۶۲۲ھ ہے۔

مولانا شبلی کے خیال میں مثنوی کو جس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی، فارسی کی کسی کتاب کو آج تک نہیں ہوئی، صاحب مجمع الفصحا نے لکھا ہے کہ ایران میں چار کتابیں جس قدر مقبول ہوئیں کوئی کتاب نہیں ہوئی، شاہ نامہ، گلستاں، مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ۔ ان چاروں کتابوں کا موازنہ کیا جائے تو مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی کو ترجیح ہوگی، مقبولیت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ علما و فضلا نے مثنوی کے ساتھ جس قدر اعتنا کی اور کسی کے ساتھ نہیں کی، شرحوں کا ایک مختصر نقشہ بھی مولانا شبلی نے دیا ہے۔

مثنوی کے سوا اور مذکورۂ بالا کتابیں اپنے اپنے مضمون کے لحاظ سے اچھوتی تھیں یعنی ان سے پہلے ان مضامین پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی یا کم از کم شہرت نہیں پا چکی تھیں، اس لحاظ سے ان کتابوں کے لیے گویا میدان خالی تھا اور کوئی حریف مقابل سامنے نہ تھا، بہ خلاف اس کے مثنوی سے پہلے تصوف اور سلوک میں متعدد کتابیں موجود تھیں، ان میں سے جام جم اوحدی مراغہ (متوفی ۷۵۴ھ) اور مصباح الارواح اوحد کرمانی (متوفی ۶۳۵ھ) نے اگرچہ شہرت عام نہیں حاصل کی تھی لیکن حدیقہ اور منطق الطیر نے تو گویا تمام عالم کو چھا لیا تھا، حکیم سنائی اور خواجہ فرید الدین عطار کا ذاتی فضل و کمال اور تقدس و شہرت بھی اس درجہ کی تھی کہ ان کی تصنیفات کم درجہ کی بھی ہوتیں تب بھی دنیا ان کو آنکھوں پر رکھتی، ان باتوں کے ساتھ نفس شاعری کی حیثیت سے یہ دونوں کتابیں مثنوی سے بلند رتبہ تھیں، علاوہ یہ کہ یہ کتابیں جس ملک میں لکھی گئیں وہاں کی زبان فارسی تھی اس لیے ہر شخص ان سے لطف اٹھا سکتا تھا اور ہر صحبت و مجلس میں ان کو رواج ہو سکتا تھا، بہ خلاف اس کے مثنوی جس ملک میں تصنیف ہوئی وہاں کی زبان ترکی تھی جو آج تک قائم ہے، ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ حدیقہ اور منطق الطیر میں کسی قسم کے دقیق اور پیچیدہ مسائل نہیں بیان کیے گئے تھے، اخلاق اور تصوف کے صاف صاف خیالات تھے جو ایک بچے کی سمجھ میں آسکتے تھے، بہ خلاف اس کے مثنوی کا بڑا حصہ ان مسائل کے بیان میں ہے جو دقیق النظر علما کی سمجھ میں مشکل سے آسکتے ہیں، یہاں تک کہ بعض بعض مقامات باوجود بہت سی شرحوں کے آج تک

لاینحل ہیں۔

ان تمام موانع کے ساتھ مثنوی نے وہ شہرت حاصل کی کہ آج حدیقہ اور منطق الطیر کے اشعار مشکل سے ایک آدھ آدمی کے زبان پر ہوں گے بہ خلاف اس کے مثنوی کے اشعار بچہ بچہ کی زبان پر ہیں اور واعظوں کی گرمی محفل تو بالکل مثنوی کے صدقے سے ہے۔ (۱)

مولانا شبلی کسی کتاب کی مقبولیت کے دو طریقے بتاتے ہیں کہ کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ سادگی اور صفائی اور عام دل آویزی کی وجہ سے پہلے وہ کتاب عوام میں پھیلتی ہے پھر رفتہ رفتہ خواص بھی اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور مقبول عام ہو جاتی ہے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ کتاب عوام کے دست رس سے باہر ہوتی ہے، اس لیے اس پر صرف خواص کی نظر پڑتی ہے، خواص جس قدر زیادہ اس پر توجہ کرتے ہیں، اسی قدر اس میں زیادہ نکات اور دقائق پیدا ہوتے جاتے ہیں، خواص کی توجہ اور اعتنا و تحسین کی وجہ سے عوام میں بھی چرچا پھیلتا ہے اور لوگ تقلیداً اس کے معتقد اور معترف ہوتے ہیں، رفتہ رفتہ یہ دائرہ تمام ملک کو محیط ہو جاتا ہے، مثنوی کی مقبولیت اسی قسم کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی مقبولیت اور کسی کتاب کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم یا نثر میں لکھی گئی ہیں، کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، فارسی پر موقوف نہیں، اس قسم کے نکات اور دقائق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے پتا لگتا ہے، اس لحاظ سے اگر علما اور ارباب فن نے مثنوی کی طرف تمام اور کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی اور یہاں تک مبالغہ کیا کہ ع ہست قرآں در زبان پہلوی تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ (۲)

لیکن اسی کے ساتھ یہ عبرت انگیز بات بھی تحریر کی ہے کہ مفتی میر عباس صاحب مرحوم مثنوی کی مقبولیت کی ایک اور وجہ بتاتے ہیں:

در تصوف می شود شیریں کلام   زاں کہ باشد در گنہ لذت تمام

اور اپنی مثنوی ''من و سلوی'' کی مدح میں فرماتے ہیں:

ایں کلام صوفیانِ شوم نیست   مثنویٔ مولویٔ روم نیست

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۵۲ و ۵۳ (۲) ایضاً، ص ۵۳۔

اس پر مولانا شبلی نے مختصر مگر حقیقت افروز یہ تبصرہ کیا ہے ''سچ ہے ع عیب نماید ہنرش درنظر'' (۱)

مثنوی کی ترتیب: مولانا شبلی فرماتے ہیں، مثنوی سے پہلے تصوف و اخلاق میں لکھی گئی کتابوں کا یہ انداز تھا کہ اخلاق و تصوف کے مختلف عنوان قائم کر کے اخلاقی حکایتیں لکھتے تھے اور ان سے نتائج پیدا کرتے تھے، منطق الطیر اور بوستاں کا یہی انداز ہے، حدیقہ میں اکثر مسائل کو مستقل طور پر بھی بیان کیا ہے، مثلاً نفس، عمل، تنزیہ صفات، معرفت، وجد، توکل، صبر و شکر وغیرہ کے تحت ان کی حقیقت بیان کی ہے لیکن مثنوی میں کسی قسم کی ترتیب و تبویب نہیں، دفتروں کی تقسیم بھی خصوصیتِ مضمون کے لحاظ سے نہیں بلکہ جس طرح قرآن مجید کے پارے یا ایک شاعر کے متعدد دیوان ہوتے ہیں۔

خود مولانا کے زمانے میں اس پر اعتراضات ہوئے انہوں نے ان کے جوابات دیے، اعتراضات کا حاصل یہ ہے کہ مثنوی کا طریقہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ فقر اور سلوک کے جو مقامات ہیں، تبتل اور فنا سے لے کر وصل تک سب بہ تفصیل اور بہ ترتیب الگ الگ بیان کیے جاتے، مولانا نے اس کے بہ جائے طفلانہ قصے بھر دیے۔

جملہ سرتاسر فسانہ است و فسوں   کود کانہ قصۂ بیرون و دروں

مولانا روم نے اس کا جواب یہ دیا کہ کفار نے قرآن مجید پر بھی یہی اعتراض کیے تھے۔

چوں کتاب اللہ بیامد ہم براں   آں چنیں طعنہ زدند آں کافراں
کہ اساطیر ست و افسانہ نثرند   نیست تعمیقے و تحقیقے بلند

پھر فرماتے ہیں:

حرف قرآں را مداں کہ ظاہرست   زیر ظاہر باطنے ہم قاہرست
زیر آں باطن یکے بطنے دگر   خیرہ گردد، اندر و فکر و نظر
ہم چنیں تا ہفت بطن ای بو الکرم   می شمر تو ایں حدیث معتصم (۲)

علمی اور اخلاقی تصنیفات کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ مستقل حیثیت سے مسائلِ علمی

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۵۴ (۲) ایضاً، ص ۵۴ و ۵۵۔

بیان کیے جائیں، دوسرے یہ کہ کوئی قصہ اور افسانہ لکھا جائے اور علمی مسائل موقع بہ موقع اس کے ضمن میں آتے جائیں، یہ طریقہ اس لحاظ سے اختیار کیا جاتا ہے کہ جو لوگ روکھے پھیکے علمی مضامین پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرسکتے وہ قصہ اور لطائف کی چاٹ سے اس طرف متوجہ ہوں، مولانا نے یہی طریقہ پسند کیا اور فرمایا:

خوش تر آں باشد کہ راز دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں(۱)

حدیقہ اور مثنوی کے مشترک مضامین: یہ امر یقینی ہے کہ مولانا روم نے حدیقہ اور منطق الطیر کو سامنے رکھ کر مثنوی لکھی جس کا خود ان کو اعتراف بھی ہے، بعض موقعوں پر باوجود بحر مختلف ہونے کے مثنوی میں حدیقہ کے اشعار نقل کیے ہیں اور ان کی شرح لکھی ہے، بعض جگہ حدیقہ کے اشعار سے مضمون میں بالکل توارد ہوگیا ہے، مثلاً حدیقہ میں جہاں نفس کی حقیقت لکھی ہے، اس موقع کا شعر ہے:

روح با عقل و علم داند زیست روح را پارسی و تازی نیست

مولانا فرماتے ہیں:

روح با علم ست با عقل ست یار روح را تازی و ترکی چہ کار(۲)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا حدیقہ کو استفادتاً پیش نظر رکھتے تھے اور اس وجہ سے حدیقہ کے الفاظ اور ترکیبیں بھی ان کی زبان پر چڑھ گئی تھیں لیکن مولانا شبلی کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ مولانا روم کا تواضع اور نیک نفسی ہے ورنہ مثنوی کو حدیقہ اور منطق الطیر سے وہی نسبت ہے جو قطرہ کو گوہر سے ہے، سیکڑوں حقائق و اسرار جو مثنوی میں بیان ہوئے ہیں، حدیقہ وغیرہ میں سرے سے ان کا پتا نہیں، جو خیالات دونوں میں مشترک ہیں ان کی بعینہ یہ مثال ہے جس طرح کسی شخص کو کسی چیز کا ایک دھندلا سا خیال آئے اور ایک شخص پر اس کی حقیقت کھل جائے، نمونے کے جو اشعار مولانا شبلی نے درج کیے ہیں ان میں مولانا اور حدیقہ کے بیان کا قدر مشترک یہ ہے کہ دل جب تک آلودۂ ہوا و ہوس ہے، دل نہیں لیکن مولانا روم نے اس کے ساتھ دقیق فلسفیانہ نکتے بیان کیے ہیں، فلاسفہ میں اختلاف ہے کہ رنج و مسرت، لذت و ناگواری اشیائے خارجی کا

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۵۵ (۲) ایضاً ص ۵۶۔

خاصہ ہے، یا تخیل کا، مثلاً اولاد کے وجود سے جو خوشی ہوتی ہے، یہ خارجی اور مادی چیز کا اثر ہے یا ہمارے تصور اور تخیل کا، فلاسفہ کا ایک گروہ قائل ہے کہ لذت اور مسرت وغیرہ اعتباری چیزیں ہیں اور ہمارے تصور اور خیال کے تابع، جانوروں کو اپنے بچوں سے (بڑے ہونے کے بعد) کوئی تعلق نہیں رہتا، نہ ان کو بچوں کے دیکھنے سے کوئی مسرت حاصل ہوتی ہے، بہ خلاف اس کے انسان کو اولاد کے وجود سے بے انتہا مسرت ہوتی ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ انسان کے دل میں اولاد کے فوائد کا جو تخیل ہے وہ جانور میں نہیں، اس بنا پر اصل لذت اور مسرت خیال کے تابع ہے، اسی طرح لہو و لعب، رقص و سرود سے جو لطف حاصل ہوتا ہے ہمارے خیال کا نتیجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے متعلق انسانوں کے مختلف افراد میں اختلاف ہوتا ہے، ایک شخص کو کسی علمی کام میں مشغول ہونے سے جو لطف آتا ہے وہ لہو و لعب سے نہیں ہوتا، اسی بنا پر بچوں، جوانوں، بوڑھوں کے مسرات اور لذات میں اختلاف ہوتا ہے، کیوں کہ ان کے تخیل اور تصور میں اختلاف ہے، اسی خیال کو مولانا نے ان اشعار میں بیان کیا ہے:

لطفِ شیر و انگبیں عکسِ دل ست سرخوشیِ آں خوش از دل حاصل ست
پس بود دل جوہر و عالم عرض سایۂ دل چوں بود دل را عرض

دل وہ چیز ہے جس کے تزکیہ سے وہ ادراکات حاصل ہوتے ہیں جو حواس سے نہیں ہوتے۔

آینۂ دل چوں شود صافی و پاک نقش ہا بینی بروں از آب و خاک(۱)

صوفیہ کی اصطلاح میں عارف کو نے (بانسری) سے تعبیر کرتے ہیں، حدیقہ اور مثنوی سے اس کے متعلق اشعار نقل کر کے لکھتے ہیں:

"اسی طرح اور بہت سے مضامین دونوں کتابوں میں مشترک ہیں، ان کے موازنہ کرنے سے دونوں کا فرق صاف واضح ہوجاتا ہے"۔(۲)

مولانا روم کی شاعری کے متعلق مولانا شبلی کا خیال: اوپر مولانا شبلی کے جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوا ہوگا کہ وہ شاعر کی حیثیت سے مولانا کی عظمت کے زیادہ قائل نہ تھے، خود سنائی اور عطار بھی شاعر کی حیثیت سے ان سے بڑھے ہوئے تھے، یہاں بھی لکھتے ہیں:

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۵۸ (۲) ایضاً ص ۵۹۔

''مولانا روم کا فن شاعری نہ تھا، اس بنا پر ان کے کلام میں وہ روانی، برجستگی، نشست الفاظ، حسن ترکیب نہیں پائی جاتی جو اساتذہ شعرا کا خاص انداز ہے، اکثر جگہ غریب اور نامانوس الفاظ آجاتے ہیں، فک اضافت جو مذہب شعر میں کم از کم گناہ صغیرہ ہے، مولانا کے ہاں اس کثرت سے ہے کہ طبیعت کو وحشت ہوتی ہے، تعقید لفظی کی مثالیں بھی اکثر ملتی ہیں تاہم سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعر ایسے بھی ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں جن کا جواب نہیں''۔(۱)

مولانا شبلی نے قریباً تیس اشعار نقل کیے ہیں، ہم نے اس میں بھی کم کردیے ہیں۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے علاج نخوت و ناموس ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما
وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا   بندہ ما را ز ما کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی   نے برائے فصل کردن آمدی
ہر کسے را سیرتے بہ نہادہ ایم   ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم
در حق او مدح و در حق تو ذم   در حق او شہد و در حق تو سم
ما بروں را نہ نگریم و قال را   ما دروں را بہ نگریم و حال را
موسیا ! آداب داناں دیگراند   سوختہ جان و رواناں دیگراند
خون شہیدان را ز آب اولی تر است   ایں گناہ از صد ثواب اولی تر است
ملتِ عشق از ہمہ دینہا جدا است   عاشقاں را مذہب و ملت خدا است
پای استدلال خود چوبیں بود   پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
گر بہ استدلال کار دیں بدے   فخر رازی رازدار دیں بدے
گفت ما اول فرشتہ بودہ ایم   راہ طاعت را بہ جاں پیمودہ ایم
سالکان راہ را محرم بدیم   ساکنانِ عرش را ہم دم بدیم
پیشۂ اول کجا از دل رود   مہر اول کے ز دل زائل شود

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۶۰۔

در سفر گر روم بینی یا ختن   از دل تو کے رود حب الوطن
ما ہم از مستانِ ایں مے بودہ ایم   عاشقانِ درگہِ وے بودہ ایم
آں خلیفہ گفت کای لیلیٰ توئی   کز تو مجنوں شد پریشان و غوی
از دگر خوباں تو افزوں نیستی   گفت خامش شو کہ مجنوں نیستی (۱)

مولانا شبلی سخن سنج ہی نہیں بڑے سخن فہم اور ذوق سلیم کے مالک تھے، آخری شعر کی جو تشریح کی ہے، وہ اس کا ثبوت ہے، فرماتے ہیں:

''اس مضمون کو شیخ سعدی نے گلستاں میں نہایت خوبی سے ادا کیا تھا، چنانچہ یہ فقرہ ضرب الامثال میں داخل ہے ''لیلی را بہ گوشۂ چشم مجنوں بایستی نگریست''، لیکن مولانا نے جس انداز سے اس مضمون کو ادا کیا ہے وہ فصاحت و بلاغت دونوں میں شیخ کے طرز ادا سے بڑھا ہوا ہے، اول تو شیخ نے سوال کا مخاطب مجنوں کو قرار دیا ہے، بہ خلاف اس کے مولانا نے خود لیلی کو مخاطب قرار دیا، اس سے ایک خاص لطافت پیدا ہوگئی ہے جو ذوق سلیم پر مخفی نہیں، دوسرے جو مضمون شیخ نے ایک بڑے جملے میں ادا کیا تھا وہ صرف ان دو لفظوں سے ادا ہوا ''مجنوں نیستی'' باوجود اس اختصار کے بلاغت و جامعیت میں یہ دو لفظ شیخ سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں''۔(۲)

مثنوی کے مطالب کے متعلق چند امور بہ طور اصول موضوعہ: ۱- مولانا روم کے زمانے میں اشاعرہ کے عقائد تمام اسلامی دنیا میں پھیلے ہوئے تھے، امام رازی نے ان کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا تھا کہ اب تک در و دیوار سے آواز بازگشت آرہی تھی، اس عالم گیر طوفان سے مولانا محفوظ نہیں رہ سکتے تھے، تاہم ان کا قدم کہیں پھسلنے نہیں پاتا، وہ اکثر اشاعرہ کے اصول پر عقائد کی بنیاد رکھتے ہیں لیکن جب ان کی تشریح کرتے ہیں تو اوپر کے چھلکے اترتے جاتے ہیں اور اخیر میں مغز سخن رہ جاتا ہے۔(۳)

۲- مثنوی میں کثرت سے غلط روایتیں اور حکایتیں مذکور ہیں لیکن اس زمانے سے آج

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۶۰ و ۶۱ (۲) ایضاً ص ۶۱ (۳) ایضاً ص ۶۲۔

تک مسلمانوں کا بڑا حصہ ان کو مانتا آتا ہے، مولانا ان روایتوں سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں، ان کو الگ کرنے سے مثنوی کی عمارت بے ستون رہ جاتی ہے، اس سے بہ ظاہر قیاس یہ ہوتا ہے کہ مولانا بھی ان دوراز کار روایتوں کو صحیح سمجھتے تھے لیکن متعدد جگہ مولانا نے تصریح کی ہے کہ ان حکایتوں اور روایتوں کو وہ محض مثالاً ذکر کرتے ہیں جس طرح نحو کی کتابوں میں فاعل و مفعول کے بہ جائے ضَرَبَ زَیْدٌ عَمرواً مثال میں استعمال کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ ”زید نے عمرو کو مارا“ اس پر کسی نے اعتراض کیا کہ عمرو نے گناہ کیا کیا تھا؟ نحوی نے کہا اس سے کسی واقعہ کا اظہار مقصود نہیں بلکہ عمرو وزید سے اعراب کا ظاہر کرنا مقصود ہے، غرض یہ کہ اسی طرح ان روایات اور حکایات سے اصل واقعہ مقصود نہیں بلکہ نتائج سے غرض ہے، واقعہ صحیح ہو یا غلط۔ (۱)

۳- فلسفہ خواہ اخلاقی ہو، خواہ الٰہیات، خواہ حقائق کائنات کا - ادراک، محسوس اور بدیہی چیز نہیں، ممالک مغرب میں آج کل جو فلسفہ کی مختلف شاخیں موجود ہیں گو نہایت قریب الفہم اور اوقع فی النفس ہیں لیکن قطعی اور یقینی نہیں، ان کی صحت اور واقعیت کی دلیل صرف یہی ہے کہ اس کے مسائل دل میں اتر جاتے ہیں لیکن اگر کوئی انکار پر آمادہ ہو تو دلائل قطعیہ سے ان کو ثابت نہیں کیا جاسکتا، مولانا شبلی نے فلسفہ جدید کے ایک بڑا مسئلہ ارتقا کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مولانا روم جو دلائل پیش کرتے ہیں اس سے مسئلہ مبحوث فیہ کی صحت اور واقعیت کا دل میں اذعان یا ظن غالب ہو جاتا ہے اور مسائل فلسفیہ کی واقعیت کی یہی اخیر سرحد ہے، اشاعرہ اور مولانا روم کے طرز استدلال میں یہ فرق ہے کہ اشاعرہ جس چیز کو ثابت کرتے ہیں اس کو بہ زور منوانا چاہتے ہیں، مثلاً یہ کہ اگر یہ نہ ہوگا تو یہ لازم آئے گا اور یہ لازم آئے گا تو محال لازم آئے گا، مخاطب ان فرضی محالات کے دام میں گرفتار ہو جانے کے ڈر سے بعض اوقات مسئلہ کو مان لیتا ہے لیکن جب دل کو ٹٹولتا ہے تو اس میں یقین یا ظن کی کوئی کیفیت نہیں پاتا، بہ خلاف اس کے مولانا محالات اور ممتنعات کا ڈراوا نہیں دکھاتے بلکہ مسئلہ مبحوث فیہ میں جو استبعاد ہوتا ہے اس کو مختلف تمثیلات اور تشبیہات سے دور کرتے ہیں اور ایسے بہت سے قرائن پیش کرتے ہیں جن سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا یوں ہونا زیادہ قرین عقل ہے، قیاس شمولی (۲) کے بجائے مولانا کا استدلال

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۶۲، ۶۳ (۲) اکثر کتب منطق میں غالباً اس کو قیاس اقترانی لکھا ہے، جس کی متعدد قسمیں ہیں (ض)

زیادہ تر قیاس تمثیلی کی صورت میں ہوتا ہے، اسی بنا پر مثنوی میں نہایت کثرت سے تمثیل وتشبیہ سے کام لیا گیا ہے، مثلاً ان کو یہ ثابت کرنا ہے کہ وارفتگان محبت آداب شرع کے پابند نہیں ہوتے، اس پر وہ قیاس شمولی سے استدلال نہیں کرتے بلکہ تمثیل کے ذریعہ سے اس طرح سمجھاتے ہیں۔

خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ تر است — ایں گناہ از صد ثواب اولیٰ تر است
درمیانِ کعبہ رسم قبلہ نیست — چہ غم از غواص را پا چلہ نیست (۱)

مثنوی کی خصوصیات: مولانا شبلی کے نزدیک مثنوی کا طرز استدلال اور طریقہ افہام اس کی سب سے بڑی خوبی ہے، فرماتے ہیں کہ استدلال کے تین طریقے ہیں، قیاس، استقرا، تمثیل۔ ارسطو نے قیاس کو ترجیح دی تھی، اس کی تقلید سے حکمائے اسلام میں بھی اسی طریقے کو زیادہ تر رواج ہوا، علامہ ابن تیمیہؒ نے ثابت کیا ہے کہ قیاس شمولی کو قیاس تمثیلی پر کوئی ترجیح نہیں بلکہ بعض وجوہ سے تمثیلی کو ترجیح ہے، مولانا روم نے زیادہ تر اسی سے کام لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عام طبائع کے افہام و تفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم یہی طریقہ ہے، استدلال تمثیلی کے لیے تخیل کی بڑی ضرورت ہے، جو شاعری کی سب سے ضروری تر شرط ہے، اس بنا پر مثنوی کے لیے یہی طریقہ زیادہ مناسب تھا، تصوف اور سلوک کے مسائل اور مسلمات، عام ادراک بشری سے خارج ہیں، الٰہیات کے اکثر مسائل بھی عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہیں، اس لیے ان کو سمجھانے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان کو مثالوں اور تشبیہوں کے ذریعہ سے سمجھایا جائے، الٰہیات کے مسائل میں اکثر متکلمین امکان کے ثابت کرنے سے کام لیتے ہیں اور اس کو ایسے دلائل سے ثابت کرتے ہیں جو دل میں جانشین نہیں ہوتے بلکہ ان سے صرف طباعی اور زور آوری کا ثبوت ملتا ہے، حالاں کہ امکان کے ثابت کرنے کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ مثالوں کے ذریعہ سے ثابت کیا جائے، مولانا روم ان دقیق مسائل کو ایسی نادر اور قریب الفہم تمثیلوں سے سمجھاتے ہیں جن سے بہ قدر امکان ان کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے یا کم از کم ان کے امکان کا یقین ہو جاتا ہے، مولانا شبلی نے اس کی متعدد مثالیں مثنوی سے دی ہیں۔

مثلاً یہ مسئلہ کہ خدا کا تعلق عالم سے اور روح کا تعلق جسم سے اس طرح ہے کہ نہ اس کو متصل کہہ سکتے ہیں، نہ منفصل، نہ قریب، نہ بعید، نہ داخل نہ خارج، بہ ظاہر ایسا مسئلہ ہے جو سمجھ

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۶۳ تا ۶۵۔

میں نہیں آتا، مولانا روم نے تمثیل کے ذریعہ اس کو جس طرح سمجھایا ہے مولانا شبلی کے لفظوں میں اس کا لب لباب یہ ہے:

"آنکھ میں قوت باصرہ، ناک میں شامہ، زبان میں گویائی، دل میں شجاعت، یہ تمام چیزیں اس قسم کا تعلق رکھتی ہیں جس کو نہ متصل کہہ سکتے ہیں، نہ منفصل، نہ قریب، نہ بعید، اسی طرح روح کا تعلق جسم سے اور خدا کا تعلق مخلوقات سے ہے"۔(۱)

یا مثلاً یہ مسئلہ کہ مقام فنا میں انسان صفات الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے اور اس عالم میں اس کا انا الحق کہنا جائز ہے، اس طرح ثابت کیا ہے:

رنگ آہن محو رنگ آتش ست　　زآتشی می لافد و آہن وش است
چوں بسرخی گشت ہم چو زرکان　　پس انا النار است لافش بے گمان
شد ز رنگ و طبع آتش محتشم　　گوید او من آتشم من آتشم
آتشم من گر تراشک ست و ظن　　آزموں کن دست را بر من بزن

یا مثلاً اس امر کو کہ عالم استغراق میں شریعت کی پابندی باقی نہیں رہتی، اس طرح ذہن نشین کیا ہے:

موسیا آداب داناں دیگراند　　سوختہ جان و رواناں دیگراند
خون شہیداں را ز آب اولی تراست　　ایں گناہ از صد ثواب اولی تر است
درمیان کعبہ رسم قبلہ نیست　　چہ غم ار غواص را پاچلہ نیست
عاشقاں را ہر زمان سوزیدنی است　　بردہ ویراں خراج و عشر نیست(۲)

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ عارف کامل کو باقی اور فانی دونوں کہہ سکتے ہیں لیکن مختلف اعتبار سے۔ مولانا روم کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا شبلی لکھتے ہیں "شمع کی لو آفتاب کے آگے ہست بھی ہے اور نیست بھی، ہست اس لحاظ سے کہ اگر اس پر روئی رکھ دو تو جل جائے گی اور نیست اس لیے کہ اس کی روشنی نہیں نظر آسکتی، اسی طرح من بھر شہد میں اگر تولہ بھر سرکہ ڈال دو تو سرکہ کا مزہ بالکل نہیں معلوم ہوگا لیکن شہد کا وزن بڑھ جائے گا، اس لحاظ سے سرکہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے، اسی

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۶۵ تا ۶۷ (۲) ایضاً، ص ۶۷۔

طرح عارف کامل جب فنا فی اللہ کے مرتبہ میں ہوتا ہے تو ہست بھی ہوتا ہے اور نیست بھی"۔(۱)

۲- دوسری خصوصیت یہ بتائی ہے کہ فرضی حکایتوں کے ضمن میں اخلاقی مسائل کی تعلیم کا جو طریقہ مدت سے چلا آتا تھا مولانا روم نے اس کو کمال کے مرتبہ تک پہنچا دیا، اس طریقہ تعلیم کا کمال امور ذیل پر موقوف ہے:

۱- نتیجہ فی نفسہٖ اچھوتا اور نادر اور اہم ہو۔ ۲- نتیجہ حکایت سے نہایت مطابقت رکھتا ہو گویا حکایت اس کی تصویر ہو۔ ۳- حکایت کی اثنا میں نتیجہ کی طرف ذہن منتقل نہ ہو سکے بلکہ خاتمہ پر بھی جب تک خود مصنف اشارہ یا تصریح نہ کرے نتیجہ کی طرف خیال منتقل نہ ہونے پائے، اس سے طبیعت پر ایک استعجاب کا اثر پڑتا ہے اور مصنف کی تخییل کی قوت ثابت ہوتی ہے۔

مولانا شبلی کے خیال میں یہ تمام باتیں جس قدر مثنوی کی حکایتوں میں پائی جاتی ہیں اس قسم کی اور کتابوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں، مولانا روم نے ان حکایتوں کے ضمن میں نفس انسانی کے جن پوشیدہ اور دور از نظر عیوب کو ظاہر کیا ہے، عام لوگوں کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں، پھر ان کو ادا اس طرح کیا ہے کہ ہر شخص حکایت کو پڑھ کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ یہ تو خاص میرا ہی ذکر ہے، مولانا شبلی نے اس کی کئی مثالیں مثنوی سے نقل کی ہیں، ایک حکایت شیر اور صحرائی جانوروں کے اس معاہدہ کی ہے کہ جانور ہر روز شیر کو گھر بیٹھے اس کی خوراک پہنچا دیں گے، پہلے ہی دن جو خرگوش شیر کی خوراک کے لیے متعین کیا گیا وہ ایک دن دیر کر کے گیا، شیر غصہ میں بھرا ہوا بیٹھا تھا، اس نے دیر کی وجہ پوچھی، خرگوش نے کہا کہ میں تو اسی دن چلا تھا لیکن راہ میں ایک دوسرے شیر نے روک لیا، میں نے اس سے بہتیرا کہا کہ میں حضور کی خدمت میں جاتا ہوں لیکن اس نے ایک نہ سنی، بڑی مشکل سے ضمانت لے کر مجھ کو چھوڑا، شیر نے بپھر کر کہا کہ وہ شیر کہاں ہے؟ میں اس کو ابھی چل کر سزا دیتا ہوں، خرگوش آگے آگے ہولیا اور شیر کو ایک کنوئیں کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا کہ حریف اس میں ہے، شیر نے کنوئیں میں جھانکا اور اپنے ہی عکس کو اپنا حریف سمجھا، بڑے غصے سے حملہ آور ہو کر کنوئیں میں کود پڑا۔

یہ مضمون کہ انسان کو اپنے عیب نظر نہیں آتے اور دوسروں کے عیب اچھی طرح نظر آتے ہیں،

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۶۸۔

اخلاق کا متداول مسئلہ ہے اور اس کو مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے لیکن اس کو مولانا روم نے جس پیرایے میں ادا کیا ہے سب سے بڑھ کر موثر طریقہ ہے، شیر نے جب اپنا عکس کنوئیں میں دیکھا تو بڑے غصے سے اس پر حملہ کیا لیکن اس کو یہ خیال نہ آیا کہ میں خود اپنے آپ پر حملہ کر رہا ہوں، ہماری بھی یہی حالت ہے، ہم دوسروں میں جو عیوب دیکھتے ہیں ہم کو نہایت بدنما معلوم ہوتے ہیں، ہم کو ان سے سخت نفرت ہوتی ہے، ہم نہایت سختی سے اس کی برائی بیان کرتے ہیں لیکن ہم نہیں خیال کرتے کہ یہی عیب خود ہم میں بھی موجود ہے اور اس بنا پر ہم خود اپنے آپ کو برا کہہ رہے ہیں۔

عکس خود را او عدوے خویش دید — لا جرم بر خویش شمشیرے کشید

اے بسا عیبے کہ بینی در کساں — خوے تو باشد در ایشاں اے فلاں

حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد — ہم چوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

نفس تست آں ما در بد خاصیت — کہ فسادِ اوست در ہر ناحیت

پس بکش او را کہ بہرِ آں دنی — ہر دمے قصد عزیزے می کنی

از وی ایں دنیای خوش برتست جنگ — از پیِ او با حق و با خلق جنگ (۱)

ایک اور حکایت ملاحظہ ہو، یہ مسئلہ کہ فرق مختلفہ میں جو اختلاف ہے، درحقیقت لفظی اختلاف ہے ورنہ سب کا مقصود اصلی ایک ہی ہے، اس لیے باہم نزاع و مخاصمت اور کشت و خون صرف غلط فہمی کا نتیجہ ہے، اس کو جس پیرایے میں ادا کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص نے چار آدمیوں کو جو مختلف قوم کے تھے، ایک درہم دیا، ان میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ یہ کس کام میں صرف کیا جائے، ایرانی نے کہا انگور منگوائے جائیں، عرب نے کہا ہرگز نہیں بلکہ عنب، رومی نے کہا نہیں بلکہ استافیل، ترک نے کہا نہیں بلکہ اُزم، حالاں کہ چاروں اپنی زبان میں انگور ہی کا نام لے رہے تھے، اس موقع پر اگر کوئی شخص چاروں زبانوں سے واقف ہوتا تو انگور لا کر سامنے رکھ دیتا اور سب اختلاف جاتا رہتا۔ (۲)

ایک اور حکایت کا لب لباب یہ ہے کہ ایک گاؤں میں ایک نہایت بدآواز موذن رہتا تھا، لوگوں نے اس کو کچھ روپے دیے کہ حج کر آئے، وہ حج کے لیے روانہ ہوا، راہ میں ایک گاؤں آیا،

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۶۹ تا ۷۱ (۲) ایضاً ص ۷۱ و ۷۲۔

وہاں ایک مسجد تھی، موذن نے اس میں جا کر اذان دی تھوڑی دیر کے بعد ایک مجوسی کچھ شیرینی اور کپڑے لیے ہوئے آیا کہ موذن صاحب کہاں ہیں، میں ان کو یہ نذر دینے لایا ہوں، انھوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے، میری ایک لڑکی نہایت عاقلہ اور نیک طبع ہے، اس کو معلوم نہیں کیوں کر مذہب اسلام کی طرف ہوگیا تھا، ہر چند میں نے سمجھایا مگر وہ باز نہیں آتی تھی، آج جو اس موذن نے اذان کہی تو لڑکی نے گھبرا کر پوچھا کہ یہ کیسی مکروہ آواز ہے، لوگوں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کا شعار اور ان کی ادائے عبادت کا طریقہ ہے، پہلے تو اس کو یقین نہ آیا لیکن جب تصدیق ہوئی تو اس کو اسلام سے نفرت ہوگئی، اس صلہ میں موذن کے پاس یہ تحفہ لایا ہوں کہ جو کام مجھ سے کسی طرح انجام نہ پاسکا، ان کی بہ دولت پورا ہوگیا، اب لڑکی کی طرف سے اطمینان ہوگیا کہ وہ کبھی اسلام نہیں لانے کی۔

اس حکایت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آج کل مسلمان اپنا جو نمونہ دکھا رہے ہیں اس سے دوسری قوموں کو اسلام سے بہ جائے محبت کے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ (۱)

مناظرات: اخلاق وسلوک کے بعض مسائل میں اہل نظر مختلف الرائے ہیں، ان کو مولانا روم نے فرضی مناظروں کی ذیل میں ادا کیا ہے، چوں کہ ان مسائل میں غلط پہلو کی طرف بھی دلائل موجود ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو غلطی ہوتی ہے، اس لیے مناظرہ کی ذیل میں جانب مقابل کے تمام استدلالات ذکر کیے ہیں اور پھر محققانہ فیصلہ کیا ہے، جس سے تمام غلط فہمیاں دور ہوجاتی ہیں۔

توکل: اکثر صوفیہ توکل کو سلوک کا ایک بڑا پایہ سمجھتے ہیں اور یہ خیال رفتہ رفتہ مختلف صورتوں میں قوم کے اکثر افراد میں سرایت کر گیا ہے، مولانا روم نے اس مسئلہ کو ایک فرضی مناظرہ کی ذیل میں طے کیا ہے، جو جنگل کے جانوروں اور شیر میں واقع ہوا ہے، جانوروں نے توکل اور شیر نے جہد اور کوشش کا پہلو اختیار کیا ہے، کسب اور کوشش کے مقابلے میں اہل توکل جن جن چیزوں پر استدلال کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں، مولانا نے ایک ایک کو بیان کیا اور ان کا جواب دیا پھر کوشش اور جہد کی افضلیت پر جو دلیل قائم کی وہ اس قدر پرزور ہے کہ اس کا جواب نہیں ہوسکتا یعنی یہ کہ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے نوکر کو کدال اور پھاوڑا دے دے تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ اس کا کیا مقصد ہے،

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۷۳ و ۷۴۔

اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دے دی ہے تو اس کا صرف یہی مقصد ہو سکتا ہے کہ ہم ان آلات سے کام لیں اور اپنے ارادہ و اختیار کو عمل میں لائیں، اس بنا پر توکل اختیار کرنا گویا خدا کی مرضی اور ہدایت کے خلاف کرنا ہے، باقی توکل کی جو فضیلت شریعت میں وارد ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک کام میں جب کوشش کرو تو کوشش کے نتیجے کے متعلق خدا پر توکل کرو، کیوں کہ کوشش کا کامیاب ہونا انسان کی اختیاری چیز نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ ہے۔(۱)

خلوص: اخلاق کا اصلی عنصر خلوص ہے لیکن اس کی حقیقت و ماہیت متعین کرنے میں نہایت سخت غلطیاں ہوتی ہیں، ہر شخص اپنے افعال کے متعلق خیال رکھتا ہے کہ خلوص پر مبنی ہے لیکن جب اصلی موقع آتا ہے تو وہ خودغرضی کا مخفی اثر جس کی اب تک خود اس شخص کو خبر نہ تھی ظاہر ہو جاتا ہے، اخلاق کے باب میں سب سے اہم یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کی نسبت نہایت غور و تدقیق سے اس بات کا پتا لگاتا رہے کہ وہ کہاں تک خلوص پر مبنی ہیں، مولانا روم نے خلوص کی ماہیت و حقیقت نہیں متعین کی اور نہ یہ اس قسم کی چیز ہے جس کی منطقی حد و تعریف متعین ہو سکتی ہے لیکن ایک حکایت لکھی ہے جس میں خلوص کو مجسم کر کے دکھایا دیا ہے اور گویا ایک معیار قائم کر دیا ہے جس سے ہر شخص اپنے افعال کو مطابق کر کے خلوص کے ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے، حکایت کی ابتدا اس طرح کی ہے:

از علی آموز اخلاصِ عمل   شیرِ حق را داں منزہ از دغل
در غزا بر پہلوانے دست یافت   زود شمشیرے بر آورد شتافت

اس حکایت کا حاصل یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے جہاد میں ایک کافر پر قابو پایا اور اس کو تلوار سے مارنا چاہا، اس نے جناب موصوف کے منہ پر تھوک دیا، آپ وہیں رک گئے اور تلوار ہاتھ سے ڈال دی، اس نے متحیر ہو کر پوچھا کہ یہ کیا عفو کا موقع تھا، آپ نے فرمایا میں تجھ کو خالصتاً لوجہ اللہ قتل کرنا چاہتا تھا لیکن جب تو نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرے نفس کو نہایت ناگوار ہوا اور سخت غصہ آیا، اس صورت میں خلوص نہیں رہا کیوں کہ خواہش نفسانی بھی شامل ہو گئی۔

نیم بہر حق شد و نیمے ہوا   شرکت اندر کار حق نہ بود روا(۲)

(باقی)

(۱) سوانح مولانا روم، ص ۷۵ تا ۷۸ (۲) ایضاً ص ۷۸ و ۷۹۔

شریعت اسلامی کا نزول
مکہ میں نہیں، مدینہ میں ہوا ہے

از:- جناب غلام نبی کشافی ☆

ماہنامہ "معارف" اپریل ۲۰۰۷ء کے شمارے میں پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی صاحب کا ایک مضمون "شریعت اسلامی محمدی کا آغاز وارتقا" پڑھنے کو ملا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون دراصل معروف عالم دین مولانا وحید الدین خاں صاحب کے تصور دین جو انہوں نے تعبیر کی غلطی - دین و شریعت وغیرہ کئی کتابوں میں پیش کیا ہے کے رد میں لکھا گیا ہے اور مضمون میں پورا قلمی زور سورۂ شوریٰ آیت ۱۳ کے پہلے لفظ "شرع" کے معنی پر لگا دیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے کہ اس لفظ سے سے مکی دور ہی میں شریعت اسلامی کا تذکرہ ملتا ہے لیکن جو لوگ شرعی احکام اور قوانین کا باضابطہ نزول مدنی دور میں جانتے ہیں، ان کی اسی رائے کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا ہے کہ "اس سے زیادہ لاعلمی کا باعث بلکہ گم راہی کا عامل یہ وطیرہ رہا کہ مکی سورتوں کا اور ان میں موجود احکام و تعلیمات کا تجزیہ نہیں ہوا، نہ جانے یہ خیال کیسے مستولی و غالب رہا کہ مکی سورتوں میں احکام و شریعت کا بیان ہی نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ اخلاقی تعلیمات ہیں، اسی "فکر غلطاں" نے دین و شریعت کی دوئی اور ثنویت کا نظریہ و خیال پیدا کیا اور اس نے مکی دور میں شریعت اسلامی کا فقدان پایا"۔ (معارف اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۲۵۷)

میں نے پروفیسر موصوف کے اس مضمون کو کئی بار اور غور سے پڑھا لیکن پورے مضمون میں دلائل پیش کرنے پر اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا کہ لفاظی سے کام لے کر جمہور مفسرین و شارحین کے نقطۂ نظر اور تصور دین کا رد کیا گیا ہے، پروفیسر موصوف نے اپنے اس مضمون کا آغاز اس طرح

☆ آنچار (صورہ) سری نگر، کشمیر-۱۹۰۰۱۱۔

کیا ہے۔

"بعد کے زمانے میں دین وشریعت کی جو تشریح وتعبیر کی گئی ہے وہ قرآن مجید وسنت نبوی کی تصریح کے مطابق نہیں معلوم ہوتی، قرآن مجید اور حدیث وسنت میں شریعت دین ہی کا ایک جز ہے جب کہ بعد کی تعبیر میں شریعت کو دین سے خارج سمجھنے کا عنصر در آیا ہے، دین سے بالعموم آج کل صرف عقائد واخلاق مراد لیے جاتے ہیں جن سے شریعت کا کوئی خاص واسطہ نہیں سمجھا جاتا، شریعت کو صرف احکام تک محدود کردیا گیا ہے اور وہ بھی صرف ان احکام وامور وقوانین تک جو حلال وحرام کے خانوں میں بانٹے جاتے ہیں، اسی طرح دین وشریعت کی دوئی قائم ہوگئی ہے اور اس نے آیات قرآنی، احادیث نبوی اور احکام اسلامی کی تشریح میں خاصا فساد پیدا کیا ہے، اس کا سب سے برا نتیجہ یہ نکلا کہ شریعت اسلامی کا ازلی تسلسل ٹوٹ گیا اور شرائع اسلامی کی اقدار مشترکہ اور ان کا بنیادی توافق واشتراک نظر سے اوجھل ہوگیا، ایک غلط نظریہ یہ قائم ہوگیا کہ دین اسلام اپنے اصول دین کے لحاظ سے تو؟؟ حضرت آدم علیہ السلام تا حضرت سرور عالم ﷺ یکساں رہا مگر ان کی شریعتیں مختلف ہوتی گئیں اور اس اختلاف شرائع کی لے اتنی بلند ہوئی کہ اسلامی شرائع کی یکسانیت اور موافقت، اتحاد واشتراک کا خیال ہی مٹ سا گیا، اسی کے ساتھ دوسرے غلط خیالات اور خام نظریات بھی بہت زور وشور سے وجود میں آئے، ان میں سے ایک یہ تصور بہت عام ہے کہ شریعت محمدی اسلامی کی تشکیل وتعمیر مدنی دور نبوی (۶۲۲ء-۶۳۲ء) کے دوران ہوئی اور مکی دور اسلامی (۶۱۰-۶۲۲ء) دینی دور تھا مگر تشریعی زمانہ نہ تھا، اسی کا شاخسانہ یہ خیال باطل بھی ہے کہ اصل اسلامی احکام مدنی دور نبوی کے عطایا ہیں، مکی دور نبوی صرف دینی واخلاقی تعلیمات سے وابستہ تھا، ان میں احکام وقوانین نہیں آئے اور آئے بھی تو صرف برائے نام آئے، اسی سے ایک اور غلط فہمی یہ بھی وجود میں آئی کہ احکام وقوانین اور شرائع بنیادی طور سے حاکمیت کے زمانے میں جنم لیتے اور پروان چڑھتے ہیں، مکی دور اسلام کی حاکمیت کا زمانہ نہ تھا لہذا صرف بنیادی دینی واخلاقی تعلیمات سے کام چلایا گیا، یہ تمام تصورات حقیقت کے خلاف ہیں"۔ (معارف اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۶-۲۴۵)

مذکورہ بالا اقتباس میں پروفیسر صاحب جہاں اپنے خود ساختہ موقف کے حق میں قلمی

زور لگانے کے باوجود کوئی واضح دلیل کو پیش کرنے میں قاصر رہے ہیں، وہاں انہوں نے ان تمام مفسرین وشارحین قرآن کا انتہائی مغالطہ آمیزی اور چالاکی کے ساتھ رد کیا ہے، جنہوں نے سورہ شوریٰ کی اقامت دین والی آیت سے اصول دین ہی مراد لیا ہے نہ کہ شریعت واحکام، نیز پروفیسر موصوف نے اپنے مذکورہ بالا اقتباس میں اصول دین کے ساتھ، اخلاقی تعلیمات کا فقرہ جوڑ کر اصل معاملہ کی سنگینی کو بڑی بے جگری کے ساتھ گھٹانے کی کوشش کی ہے، حالاں کہ اقامتِ دینی والی آیت سے تمام قابل ذکر مفسرین وشارحین نے اصول دینی ہی مراد لیا ہے جن کے ساتھ شرعی احکام کو جوڑنے کی کوشش نہیں کی ہے، اقامت دینی والی آیت قرآن میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ۔ (شوریٰ-۱۳)

اس نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو، مشرکین پر وہ بات بہت گراں ہے جس کی طرف تم ان کو بلا رہے ہو، اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف چن لیتا ہے اور وہ اپنی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

اس آیت میں "الدین" سے مراد اصل دین کی بنیادی تعلیمات ہیں نہ کہ کل دین، یعنی اقامت دین کے معنی یہاں سارے شرعی احکام کو لوگوں کے اوپر نافذ کرنا نہیں ہے بلکہ دین کے اس بنیادی حصہ کو پوری طرح اختیار کرنا ہے جو ہر شخص سے ہر حال میں مطلوب ہے اور یہی تفسیر تمام مفسرین نے کی ہے، چنانچہ یہاں چند معروف مفسرین کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

والدین الذی جاء به الرسول کلهم هو عبادة الله وحده لا شریک له کما قال عنه رجل ...... وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ وفی الحدیث نحن معشر الانبیاء اولاد علات دیننا واحد ای القدر المشترک بینهم هو عبادة الله وحده لا شریک له وان اختلف شرائعهم ومناهجهم کقوله جل جلاله ولکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا۔ (تفسیر القرآن العظیم، ج ۴، ص ۱۳۷)

یہ وہ دین ہے جسے تمام پیغمبر لائے اور وہ ایک اللہ جس کا کوئی شریک نہیں کی عبادت ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے "اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے کوئی پیغمبر گو یہ کہ ہم نے اس کی طرف وحی بھیجی کہ بلاشبہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو (الانبیا-۲۵) اسی طرح حدیث میں آیا ہے پیغمبروں کی جماعت آپس میں علاتی بھائی ہیں، ہمارا دین ایک ہی ہے یعنی ان کے درمیان قدر مشترک ایک اللہ جس کا کوئی شریک نہیں کی عبادت ہے، اگرچہ ان کی شریعتیں اور طریق کار مختلف ہیں جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے "ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریق کار مقرر کیا ہے" (المائدہ-۴۸)۔

علامہ ابوالسعود العمادی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای دین الاسلام الذی هو توحید الله تعالیٰ وطاعته والایمان بکتبه ورسله و بیوم الجزاء وسائر ما یکون العبد به مؤمنا والمراد باقامته تعدیل ارکانه وحفظه من ان یقع فیه زیغ والمواظبة علیه (تفسیر ابی السعود، ج ۷، ص ۲۶)

یعنی دین اسلام جو کہ اللہ تعالی کی توحید، اس کی اطاعت، اس کی کتابوں پر، اس کے پیغمبروں اور آخرت کے دن پر ایمان کا نام ہے اور وہ سب کچھ جس سے آدمی مؤمن بنتا ہے اور اقامت دین سے مراد اس کے ارکان ٹھیک طریقے سے ادا کرنا، اس کی نگہداشت اور اس پر دوام کرنا۔

اسی طرح اور بھی بہت سے مفسرین نے یہی تفسیر لکھی ہے، مثال کے طور پر علامہ فخر الدین رازی نے التفسیر الکبیر، ج ۲۷، ص ۵۶ - علامہ زمخشری نے تفسیر الکشاف، ج ۴، ص ۲۱۹ - علامہ خازن نے تفسیر الخازن، ج ۳، ص ۱۲۵ - علامہ آلوسی نے روح المعانی میں، ج ۱۴، ص ۳۳ - اور علامہ صابونی نے صفوۃ التفاسیر، ج ۳، ص ۱۲۵ میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ ایک جیسی تفسیر لکھی ہے اور ان تمام مفسرین نے یہاں اقامت دین سے اصول دین یعنی توحید، آخرت، ایک اللہ کی طاعت اور تمام کتابوں اور تمام پیغمبروں پر ایمان لانا مراد لیا ہے نہ کہ دین کے تمام انفرادی اور اجتماعی احکام زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کرنا مراد لیا ہے۔

پروفیسر موصوف اگرچہ اقامت دین کے بنیادی مفہوم جو تمام مفسرین نے سمجھا ہے کا رد کرنے سے قاصر رہے ہیں مگر انہوں نے اپنے مضمون میں اقامت دین والی آیت کے آغاز میں شرع کا لفظ آیا ہے، اسی پر اپنے نقطہ نظر کی بنیاد رکھی ہے اور اس سے شریعت اسلامی مراد لیا ہے، چنانچہ انہوں نے اسی سلسلہ میں مکی عہد نبوی کی شریعت کے عنوان کے تحت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پیغمبر اسلام کو نبوت ملنے کے آغاز ہی میں شرعی احکام سے نوازا گیا ہے، اس سلسلے میں اگرچہ وہ متعین طور پر ایک بھی واضح مثال نہیں دے سکے، تاہم انہوں نے قرآن کی چند آیات کو ان کے سیاق سے کاٹ کر ان سے غلط مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

"مکی دور نبوی کے روز اول ہی سے جب نبوت و رسالت سے سرفراز ہوئے، آپ پیغمبر آخر الزماں بنے جس طرح آپ کو دین اسلام کا آخری، عالمی اور ابدی اور کامل ترین مذہب عطا ہوا، اسی طرح آپ کو آخری شریعت بھی ملی، دین اسلام کا جو تعلق و رشتہ سابق انبیائے کرام کے ادیان اسلامی سے رہا تھا وہی شریعت محمدی کا ارتباط و ربط سابقہ شرائع اسلامی سے تھا، گذشتہ رسولانِ عظام کے دین و شریعت کے بنیادی اصول و احکام بھی آپ کو عطا فرمائے گئے تھے اور بہت سی فروع میں بھی اشتراک و توافق تھا، ان میں سے صرف ان شرائع و فروع کو تبدیل کیا گیا تھا جو گذشتہ ادوار رسالت میں زمان و مکان کے جبر اور اس کے تقاضوں کے تحت اور ان کے حاملین اور علم برداروں کے اقتضا و استطاعت کی بنا پر مقامی اور ترقی پذیر رہ گئی تھیں۔ دین

شریعت محمدی کی آفاقیت، حمیت اور ابدیت کے عناصر نے کامل ترین دین وشریعت کی حسین ترین اور انتہائی فطری اور مفید ترین صورت گری کی تھی چوں کہ اس دین وشریعت محمدی کو تا قیام قیامت باقی اور کارفرما رہنا تھا، گذشتہ تمام شرائع اسلامی کی بنیادی چیزیں شریعت محمدی کا جز بن گئی تھیں اور ان کے درمیان اختلاف سے زیادہ توافق کا عنصر تھا"۔ (ص ۲۵۹)

پروفیسر موصوف آگے پھر حضرت مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن سے ایک طویل اقتباس نقل کرنے کے بعد یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:

"ہمارے استدلال کا سارا زور مکی دور نبوی پر ہے، لہذا مدنی دور کے احکام دین و شریعت سے یہاں بحث نہیں ہے، مولانا موصوف کے مذکورہ بالا طویل ومدلل مباحث کے بعد اس پر مکی دور میں تعمیر وتشکیل اور ارتقائے شریعت کے لحاظ سے چند اضافے ناگزیر ہیں، ان میں اسلامی احکام شریعت کا مکی آغاز اصل نکتہ بحث ہے کہ مکی دور نبوی سے شریعت محمدی کی تعمیر شروع ہوئی پھر اسی دور میں ارتقا ہوا جو مدنی دور میں بھی جاری رہا اور آخر میں کامل ہوا، مختلف احکام دین وشریعت کا مکی سورتوں کی آیات کریمہ کے حوالے سے ارتقا کا ذکر اس سلسلہ میں ناگزیر ہو جاتا ہے، جس پر مختصر بحث ہی کی جاسکتی ہے کہ اصل وکامل بحث تحقیقی مطالعہ کا حصہ ہے"۔ (۶۴-۲۶۳)

پروفیسر موصوف نے اپنے اسی اقتباس میں مکی دور ہی میں شریعت اسلامی کے آغاز کا ذکر کیا ہے مگر انہوں نے جتنا زور عبارت آرائی پر دیا ہے اتنا انہوں نے دلائل پر نہیں دیا، بلکہ وہ اپنے بلند بانگ دعوے پر ایک بھی ایسی دلیل پیش نہیں کرسکے جس سے یہ واضح ہوتا کہ کس طرح کے احکام شریعت مکی دور میں نازل ہوئے تھے، البتہ انہوں نے سورہ شوریٰ آیت ۱۳ کے آغاز میں "شرع" کا جو لفظ آیا ہے اس سے شریعت محمدی اخذ کرنے کی کوشش ہے مگر خود نفس آیت کس طرح کے مضمون اور احکام کی غمازی کرتا ہے اس کی طرف سے انہوں نے مکمل صرف نظر کیا ہے، تاہم انہوں نے اپنے خود ساختہ نظریہ کی تائید میں قرآن کی ان چند آیات جن میں "شریعت" کا لفظ آیا ہے سے غلط تاویل واستدلال کرکے مکی دور کے آغاز ہی سے شریعت محمدی کا نازل ہونا مراد لیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ہمارے تمام قدیم وجدید مفسرین نے نہ سہی مگر تمام صاحب نظر اہل علم نے سورہ جاثیہ-۱۸ کی بنیاد پر شریعت اسلامی محمدی کے نفاذ اور

اس کے لازمی اتباع کا اظہار اپنی تفاسیر میں کیا ہے" (ص ۲۶۴) مگر سوال یہ ہے کہ جب تمام قدیم وجدید مفسرین وشارحین نے اس سے اساسات دین ہی مراد لیا ہے تو پھر صاحب نظر اہل علم کون لوگ ہیں؟ کیا تمام مفسرین وشارحین صاحب نظر اہل علم نہیں ہیں؟ کیا علامہ ابن کثیر، فخر الدین رازی، علامہ آلوسی، زمخشری، جرجانی، ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ جیسے چوٹی کے مفسرین اور اہل علم اس آیت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں اور اب پروفیسر موصوف کے نزدیک صاحب نظر اہل علم (مراد کے لیے مولانا مودودی) جو بیسویں صدی میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے پہلی مرتبہ اس آیت کا حقیقی مفہوم سمجھا اور باقی تمام قدیم وجدید مفسرین وشارحین، فکر غلطاں میں مبتلا تھے، دراصل پروفیسر موصوف کا ذاتی طور پر کوئی واضح تصور دین وشریعت تو نہیں ہے بلکہ ان کے قلب وذہن پر مولانا مودودی کی اسی کتاب کا غالب اثر ہے جس میں انہوں نے انتہائی جارحانہ انداز میں قرآن کی چند منتخب آیات واصطلاحات کے بارے میں قدیم وجدید مفسرین و شارحین پر اس طرح تنقید وخامہ فرسائی فرمائی ہے۔

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہو گیا، اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لئے الٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے، ان ہی دونوں وجوہ سے دور آخر کی کتب لغت وتفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے مسلمان سمجھتے تھے...... نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا"۔ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، ص ۸-۹)

استنبول ترکی سے مولانا مودودی کے دینی افکار پر ایک تنقیدی کتاب "الاستاذ المودودی" ۱۹۸۰ء میں عربی میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب میں مولانا مودودی کے دینی افکار خاص کر قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں نامی کتاب کا علمی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے تصور دین کا رد کیا

گیا ہے، یہاں اس کتاب سے بہ طور نمونہ ایک اقتباس بغیر ترجمہ کے نقل کیا جاتا ہے:

"استبان من کلامه ان اللغويين والمفسرين لم يعرفوا معانی هذه الاسماء المرادة عند الله ولم يستثن احدا منهم ولا ريب ان مثل هذه الدعوى العريضة بانه لم يفهمها احد الا الاستاذ المودودی ومن العجيب المدهش ان المودودی لما اخذ يشرحها اضطر فی شرحها الی ائمة اللغة من القرون المتوسطة کابن الاثير الجزری وابن منظور الافريقی والفيروز آبادی من "النهاية" و "اللسان" و "القاموس" دون ان يبلغ شاؤه الی قدماء اهل اللغة کابی عبيدة وابی عبيد وابی حنيفة الدينوری وابن قتيبة وغيرهم ممن بعدهم من الازهری والجوهری فکيف استقام للمودودی ان يأخذ شرحها وبيانها ومعانيها الحقيقة والمجازية من هؤلاء الذين لم يعرفوا معانيها المرادة عند العرب حيث ولدوا مسلمين فی بيوت المسلمين" ۔

" و مثل هذه الدعوى العريضة فتح باب کل زيغ وضلال يرتفع الامان عن ارباب اللغة والمفسرين طوال هذه القرون ، وفتح للتاويل فی القرآن بما يفهمه العقل والادراک کيف ما شاء دون ان يستشهد و يحتج بأئمة اللغة وارباب التفسير فانظر يارعاک الله شئی لم يعرفه محمد بن جرير الطبری الی مابعده ولا الجرجانی ولا الزمخشری ولا ابن تيمية ولا ابن القيم ولا ابن کثير ولا من قبلهم ولا من بعدهم والمودودی الذی قام يفهمه بعد هذه الفترة الطويلة من القرون الاربعة عشرة وکانت هذه الفجوة البعيدة للجهل بمعانيها ومن هذه الکلمات الاربع الاله والرب والعبادة والدين" ۔

"هل يکون جهل فاضح من هذا لم يعرفه احد من العرب ولا من العجم من اللغويين والمفسرين والمحدثين وارباب البلاغة وائمة العربية من اقدم العصور الی اليوم وانما فهمها رجل عجمی لا يجيد اللغة العربية لا

نطقاً ولا کتابةً ولا يکاد يفهمها الا بشق النفس بمعونة التراجم الاردوية" ۔ (الاستاذ المودودی وشئی من حياته وافکاره، ص ۱۸، ۱۹)

یہاں مولانا مودودی کے افکار و نظریات خاص کر ان کے تصور دین کا رد یا تنقید مقصود نہیں ہے لیکن پروفیسر موصوف نے اپنے تصور دین کی بنیاد اور ماخذ مولانا مودودی ہی کے تصور دین و شریعت کو بنایا ہے، اس لیے اس کے ضمن میں مذکورہ طویل اقتباس نقل کرنے کی ضرورت پڑی، تاکہ عام قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ پروفیسر موصوف جس تصور دین و شریعت کے حامی و ترجمان ہیں، اس کے بارے میں خود ان کا یہ اعتراف اور خیال ہے کہ یہ تمام مفسرین اور شارحین سے ہٹ کر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۱۳ کے بارے میں جو کچھ مولانا مودودی نے لکھا ہے وہ ان کے تفردات میں سے ہے اور ان کی اس تفسیر کی تائید کسی بھی قابل ذکر قدیم تفسیر میں نہیں ملتی ہے۔

اس طرح پروفیسر موصوف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اگرچہ قرآن وحدیث سے کوئی ربط وتعلق نہیں ہے اور نہ ہی انہوں نے اس معاملہ میں سیرت رسول اور کتب احادیث سے کوئی ایک آدھ مثال دی ہے اور انہوں نے جس نقطہ نظر کا رد کیا ہے وہ تمام مفسرین وشارحین کا ہے مگر انہوں نے انتہائی چالاکی سے قرآن کی چند ایسی آیات سے بھونڈا استدلال فرمایا ہے جن کی لفظی مشابہت کے سوا اصل موضوع سے کوئی ربط وتعلق نہیں ہے، مثال کے طور پر انہوں نے مکی دور میں شریعت اسلامی کے اثبات کے لئے قرآن کی اس آیت کو بنیاد بنایا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (الجاثیہ-۱۸)

پھر ہم نے تم کو دین کے ایک واضح طریقہ پر قائم کیا، پس تم اس پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ای اتبع ما اوحی اليک من ربک لا اله الا هو واعرض عن المشرکين (تفسیر القرآن العظیم، ج ۴، ص ۱۸۹)

یعنی آپ اپنے رب جس کے سوا کوئی معبود نہیں کی طرف سے جو وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی کیجیے اور مشرکین سے اعراض کیجیے۔

علامہ راغب اصفہانی نے اس آیت کو نقل کرنے کے بعد ''شریعت'' اور ''منہاج'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

قال ابن عباس الشرعة ماورد به القرآن والمنهاج ماورد به السنة وقوله (شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ) فاشارة الى الاصول التى تتساوى فيها الملل فلا يصح عليها النسخ كمعرفة الله تعالى ونحو ذالك من نحو مادل عليه قوله (وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (المفردات فی غریب القرآن، ص ۲۵۸)

حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ ''شرعہ'' وہ راستہ ہے جسے قرآن نے بیان کردیا ہے اور ''منہاج'' وہ راستہ ہے جسے سنت نے بیان کردیا ہے اور ارشاد باری ہے (اللہ نے تمہارے لیے دین مقرر کیا ہے۔الشوریٰ: ۱۳) اس آیت میں دین کے ان اصول کی طرف اشارہ ہے جن میں ساری ملتیں برابر ہیں اور جن میں نسخ صحیح نہیں ہے جسے معرفت الٰہیہ اور وہ امور جن کا بیان اس آیت میں ہوا ہے (اور جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے پیغمبروں اور آخرت کے دن کا انکار کردے۔النساء: ۱۳۶)

حقیقت یہ ہے کہ دین کے اصل اور اساسی تعلیمات ہمیشہ ساری ملتوں میں ایک جیسے رہے ہیں اور جن میں کبھی نسخ نہیں ہوا ہے اور سورہ جاثیہ ۱۸ کا سیاق اور قرآن کی نزولی ترتیب اور پس منظر اور مکی دور کے تمام حالات و واقعات پر نظر ڈالنے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح سورہ شوریٰ آیت ۱۳ میں تمام مفسرین کے نزدیک دین کے بنیادی اور اساسی تعلیمات مراد ہیں بالکل اسی طرح مذکورہ آیت میں بھی شریعت سے بنیادی اور اصولی تعلیمات مراد ہیں، چوں کہ قرآن کے بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے کئی کئی معانی ہیں مگر ان تمام معانی کو ایک ساتھ لینا درست نہیں ہے، مثال کے طور پر دین کا لفظ لیجیے: یہ بھی قرآن میں بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے، مثلاً دین بہ معنی جزا (الفاتحہ ۳)، دین بہ معنی اطاعت (النساء ۱۲۵)، دین بہ معنی قانون (یوسف ۷۶)، دین بہ معنی مذہب (الکافرون ۶) وغیرہ۔

اگر دین کے ان تمام معانی کو ایک ساتھ لیا جائے تو پھر ایسا ممکن نہیں ہے جیسا کہ دین بہ معنی جزا (الفاتحہ ۳) کا مطلب ہوگا، سورہ شوریٰ آیت ۱۳ کے مطابق تم یوم جزاء کو قائم کرو، کیوں کہ دین کا ایک معنی یہ بھی ہے حالاں کہ یوم جزا کو قائم کرنا اللہ کا مخصوص معاملہ ہے وہ سرے سے انسان کے بس میں ہے ہی نہیں، اس طرح قرآن میں شرع کا لفظ بھی کئی معانی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً شُرَّعاً بہ معنی پانی کے اوپر ظاہر ہونے والی چیزیں (الاعراف ۱۶۳)، شِرعۃ بہ معنی دستور و قانون (المائدہ ۴۸)، شرع بہ معنی راستہ مقرر کرنا (شوریٰ ۱۳)، شرعوا بہ معنی خود ساختہ دین ایجاد کرنے والے (شوریٰ ۲۱)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لفظ اکثر ایک سے زیادہ معنی رکھتا ہے، شرع کا لفظ بھی قرآن میں لغوی اور مرادی اعتبار سے کئی معنوں میں آیا ہے اور ان تمام معانی کی فہرست بنانا اور یہ کہنا کہ یہاں اقامت دین سے صرف اساس و اصول دین ہی نہیں بلکہ شریعت بھی مراد ہے، ایک غیر علمی بات ہے کیوں کہ ہر لفظ کا مفہوم ہمیشہ اس کے سیاق کے اعتبار سے ہی متعین ہوتا ہے نہ کہ مختلف مفہومات کی گنتی سے۔

شرع یا شرعۃ کا لفظ بنیادی طور پر دو ادوار سے تعلق رکھتا ہے، ایک مکی دور سے اور دوسرا مدنی دور سے، مکی دور میں قرآن کی نزولی ترتیب کے مطابق اس لفظ کا استعمال اسلام کے اصولی و بنیادی عقائد و تعلیمات کے لیے ہوا ہے جب کہ مدنی دور میں اس کا استعمال اسلام کے اصولی تعلیمات کے علاوہ دوسرے فروعی و جزوی احکام و قوانین کے لئے بھی ہوا ہے، جیسا کہ قرآن کی ایک مدنی سورہ میں شریعت کے بارے میں ایک واضح ارشاد اس طرح آیا ہے:

وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا وَ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک طریقہ ٹھہرایا ہے اور اگر خدا چاہتا تو تم کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر اللہ نے چاہا کہ وہ اپنے دیے ہوئے حکموں میں تمہاری آزمائش کرے، پس تم بھلائیوں کی طرف دوڑو، آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ

فِیهِ تَخْتَلِفُونَ (المائدہ-۴۸) کر جانا ہے، پھر وہ تم کو آگاہ کردے گا اس چیز سے جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ مکی سورتوں میں جہاں شرع یا شرعۃ کا لفظ آیا ہے وہاں من الدین (شوریٰ ۱۳) یا من الامر (جاثیہ-۱۸) کے الفاظ بھی آئے ہیں جو یہ ثابت کرتا ہے کہ مکی دور میں شریعت سے مراد دین کے اصولی اور اساسی تعلیمات ہیں جب کہ مدنی دور کی سورتوں میں اس الفاظ کا استعمال قرآن میں مجرد شریعت اسلامی کے معنی میں ہوا ہے، وہاں من الدین یا من الامر کی اضافت ہٹادی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے مکی دور زندگی میں مکمل زور عقائد کی درستگی پر دیا ہے، جس کا ثبوت قرآن وحدیث سے واضح طور پر ملتا ہے، پروفیسر موصوف نے جمہور علما اور مفسرین کی اس رائے، جس میں انہوں نے سورہ شوریٰ کی آیت ۱۳ سے دین کے اصولی واساسی تعلیمات مرادلیا ہے کی اہمیت کم کرتے ہوئے ان کے ساتھ "اخلاقی تعلیمات" کا فقرہ بھی جوڑ کر اس رائے وحقیقی تفسیر کو بے وزن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر قرآن وحدیث سے ان کے مغالطہ انگیز موقف کی کوئی تائید نہیں ہوتی ہے جیسا کہ مکی سورتوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے زیادہ تر زور اسلام کے بنیادی عقائد کی درستگی پر ہی دیا ہے نہ کہ دوسرے شرعی احکام جن کا ابھی نزول بھی نہیں ہوا تھا پر بھی عمل آوری کی تلقین شروع کردی تھی۔

قرآن کی ایک مکی سورہ میں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں آیا ہے کہ آپ خلق عظیم کے منصب پر فائز کردیے گئے ہیں جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم-۴) اور بے شک تم ایک اعلا اخلاق پر ہو۔

اسی بات کو آپؐ نے ایک حدیث میں اس طرح فرمایا ہے:

عن مالک انه قد بلغه ان رسول اللهﷺ قال بعثت لاتمم حسن الاخلاق ۔(موطا الامام مالک شرحہ تنویر الحوالک، ج ۲،ص ۲۱۱)	امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں بھیجا گیا ہوں کہ حسن اخلاق کی تکمیل کروں۔

قرآن وحدیث کے ان واضح ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن اخلاق کی تکمیل

آپؐ کے فرائض منصبی میں شامل تھی مگر مکی دور زندگی میں اس حسن اخلاق کا اعلا اور کامل نمونہ آپؐ کی ذاتی زندگی میں تو بہت ہے لیکن اس کی باضابطہ تبلیغ آپؐ نے مدنی زندگی میں فرمائی ہے اور مکی دور زندگی اس طرح کی تبلیغ سے خالی ہے اور آپؐ لوگوں کو دین کے بنیادی اور اساسی عقائد و تعلیمات کی طرف بلاتے اور دعوت دیتے رہے ہیں جس کی تائید حضرت عائشہؓ کی اس بصیرت افروز روایت سے ہوتی ہے:

انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اول شرع لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا ۔(فتح الباری کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر ۴۹۹۳-ج۹،ص ۴۶)	قرآن میں پہلے وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر ہے، یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوگئے تب حلال اور حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر پہلے ہی یہ حکم نازل ہوتا کہ زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم ہرگز زنا نہ چھوڑیں گے۔

مطلب یہ کہ ابتدائے اسلام میں نہ زنا پر کوئی حد مقرر تھی اور نہ شراب پینے اور چوری کرنے پر کوئی سزا دی جاتی تھی بلکہ اس طرح کے احکام وقوانین ہجرت کے بعد نازل ہوئے ہیں اور اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد تدریجی انداز میں شرعی حدود اور فوج داری قوانین کا نفاذ عمل میں لایا گیا ہے۔

مصر کے مشہور عالم دین اور اخوان المسلمون کے چوٹی کے رہنما سید قطب شہید کی معرکہ آرا کتاب "معالم فی الطریق" (جس کا اردو ترجمہ خلیل احمد حامدی صاحب نے "جادہ و منزل" کے نام سے کیا تھا) میں ایک جگہ "پیغمبر اسلامؐ نے اصلاح اخلاق کی مہم سے دعوت کا آغاز کیوں نہ کیا"؟ اور "اس طریقہ میں کیا کمزوری تھی" کے دو ذیلی عنوانوں کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"رسول اللہؐ کی تشریف آوری کے وقت جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح ہر پہلو سے انحطاط کے آخری کنارے تک پہنچی ہوئی تھی ...... ظلم اور جارحیت نے معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا ...... شراب خوری اور جوا بازی معاشرتی زندگی کی روایت بن چکے تھے اور ان پر فخر کیا جاتا تھا ...... زنا کاری مختلف شکلوں میں رائج تھی اور اس جاہلی معاشرے کی قابل فخر روایت بن چکی تھی، یہ ایک ایسا حمام ہے جس میں ہر دور کا جاہلی معاشرہ ننگا نظر آتا ہے خواہ وہ دور قدیم کا جاہلی معاشرہ ہو یا عہد حاضر کا نام نہاد مہذب معاشرہ ...... سوال کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہؐ چاہتے تو ایک اصلاحی تنظیم کے قیام کا اعلان کرکے اس کے ذریعہ اصلاح اخلاق، تزکیہ نفوس اور تطہیر معاشرہ کا کام شروع کردیتے، کیوں کہ جس طرح ہر مصلح اخلاق کو اپنے ماحول کے اندر چند پاکیزہ اور سلیم الفطرت نفوس ملتے رہے ہیں، اسی طرح آپؐ کو بھی ایک ایسا پاک سرشت گروہ بالیقین دست یاب ہوجاتا جو اپنے ہم جنسوں کے اخلاقی انحطاط اور زوال پر دکھ محسوس کرتا، یہ گروہ اپنی سلامتی فطرت اور نفاست طبع کے پیش نظر آپ کی دعوت تطہیر و اصلاح پر لازماً لبیک کہتا، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر رسول اللہؐ اس کام کا بیڑا اٹھاتے تو بڑی آسانی سے اچھے انسانوں کی ایک جماعت کی تنظیم میں کامیاب ہوجاتے، یہ جماعت اپنی اخلاقی طہارت اور روحانی پاکیزگی کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے بڑھ کر عقیدۂ توحید کو قبول کرنے اور اس کی گراں بار ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتی اور اس حکیمانہ آغاز سے آپؐ کی یہ دعوت کہ الوہیت صرف خدا کے لیے مخصوص ہے، پہلے ہی مرحلے میں تند و تیز مخالفت سے دوچار نہ ہوتی۔

لیکن اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزل مقصود کو نہیں جاتا، اسے معلوم تھا کہ اخلاق کی تعمیر صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہی ہوسکتی ہے، ایک ایسا عقیدہ جو ایک طرف اخلاقی اقدار اور معیار رد و قبول فراہم کرے اور دوسری طرف اس "طاقت" کا تعین بھی کرے جس سے یہ اقدار و معیار ماخوذ ہوں اور انہیں سند کا درجہ حاصل ہو......

صبر آزما کوششوں سے جب عقیدہ الوہیت دلوں میں راسخ ہوگیا اور اس "طاقت" کا تصور بھی دلوں میں اتر گیا جس سے اس عقیدہ کو سند حاصل ہوتی تھی - دوسرے لفظوں میں جب انسانوں نے اپنے رب کو پہچان کر صرف اسی کی بندگی کرنے لگے، جب انسان خواہشات نفس کی

غلامی اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی آقائی سے آزاد ہوگئے اور "لا الہ الا اللہ" کا نقش دلوں میں پوری طرح مرتسم ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ اور اس عقیدہ کے ماننے والوں کے ذریعہ وہ سب کچھ فراہم کردیا جو وہ تجویز کرسکتے تھے ......"۔ (جادہ و منزل، ص ۱۰۷ تا ۱۱۳)

سید قطب شہید نے اپنی اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ "قرآن کا طریق انقلاب" میں ایک ذیلی عنوان "مکی دور کا بنیادی مسئلہ" کے تحت یہ غور طلب سطریں تحریر فرمائی ہیں:

"قرآن کریم کا وہ حصہ جو مکی سورتوں پر مشتمل ہے، پورے ۱۳ سال تک رسول اللہؐ پر نازل ہوتا رہا، اس پوری مدت میں قرآن کا مدار بحث صرف ایک مسئلہ رہا، اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی مگر اسے پیش کرنے کا انداز برابر بدلتا رہا، قرآن نے اسے پیش کرنے میں ہر مرتبہ نیا اسلوب اور نیا پیرایہ اختیار کیا اور ہر مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ گویا اسے پہلی بار ہی چھیڑا گیا ہے۔

قرآن کریم پورے مکی دور میں اس مسئلہ کے حل میں لگا رہا، اس کی نگاہ میں یہ مسئلہ اس نئے دین کے تمام مسائل میں اولین اہمیت کا حامل تھا، عظیم تر مسئلہ تھا، اساسی اور اصولی مسئلہ تھا، عقیدہ کا مسئلہ، یہ مسئلہ دو عظیم نظریوں پر مشتمل تھا، ایک اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور انسان کی عبودیت اور دوسرے ان کے باہمی تعلق کی نوعیت، قرآن کریم اسی بنیادی مسئلہ کو لے کر انسان سے "بہ حیثیت انسان" خطاب کرتا رہا، کیوں کہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس سے تمام انسانوں کا یکساں تعلق ہے، وہ چاہے عرب کے رہنے والے انسان ہوں یا غیر عرب، نزول قرآن کے زمانے کے لوگ ہوں یا کسی بعد کے زمانے کے، یہ وہ انسانی مسئلہ ہے جس میں کسی ترمیم و تغیر کا سوال نہیں پیدا ہوتا، یہ اس کائنات میں انسان کے وجود و بقا کا مسئلہ ہے، انسان کی عاقبت کا مسئلہ ہے، اس مسئلہ کی بنیاد پر یہ طے ہوگا کہ انسان کا اس کائنات کے اندر کیا مقام ہے اور اس کائنات میں بسنے والی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ اور خود کائنات اور موجودات کے خالق کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟ یہ وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے اس مسئلے میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ یہ اس کائنات اور کائنات کے ایک حقیر جز انسان کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

مکی زندگی میں قرآن انسان کو یہ بتاتا رہا کہ اس کے اپنے وجود اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟

اور کس غرض کے لیے آیا ہے؟ اور آخر کار وہ کہاں جائے گا؟ وہ معدوم تھا اسے کس نے خلعتِ وجود بخشا؟ کون سی ہستی اس کا خاتمہ کرے گی؟ اور خاتمہ کے بعد اسے کس انجام سے دوچار ہونا ہوگا؟ - وہ انسان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اس وجود کی حقیقت کیا ہے جسے وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے؟ اور وہ کون ہستی ہے جسے وہ پردۂ غیب میں کارفرما محسوس کرتا ہے لیکن دیکھ نہیں پاتا، اس طلسماتی کائنات کو کس نے وجود بخشا اور کون اس کا منتظم و مدبر ہے؟ کون اسے گردش دے رہا ہے، کون اسے بار بار نیا پیراہن بخشتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ان تغیرات کا سررشتہ ہے جن کا ہر چشم بینا مشاہدہ کر رہی ہے؟ وہ اسے یہ بھی سکھاتا ہے کہ خالق کائنات کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ اور خود کائنات کے بارے میں اسے کیا روش اختیار کرنی چاہیے؟ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔

یہ ہے وہ اصل اور بنیادی مسئلہ جس پر انسان کی بقا اور وجود کا دار و مدار ہے اور رہتی دنیا تک اس عظیم مسئلہ پر انسان کی بقا اور وجود کا انحصار رہے گا، اس اہم مسئلے کی تحقیق و توضیح میں مکی زندگی کا پورا تیرہ سالہ دور صرف ہوا، اس لیے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ یہی ہے اور اس کے بعد جتنے مسائل ہیں وہ اس کے تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت اس کی تفصیلات اور جزئیات سے زیادہ کچھ نہیں، قرآن نے مکی دور میں اس بنیادی مسئلے کو اپنی دعوت کا مدار بنائے رکھا اور اس سے صرف نظر کر کے نظام حیات سے متعلق فروعی اور ضمنی بحثوں سے تعرض نہیں کیا اور اس وقت تک انہیں نہیں چھیڑا جب تک علم الٰہی نے یہ فیصلہ نہیں فرمادیا کہ اب اس مسئلہ کی توضیح و تشریح کا حق ادا ہو چکا ہے ......"۔ (جادہ و منزل، ص ۹۵ تا ۹۸)

سید قطب شہید کے ان اقتباسات سے اس بات پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ مکی دور میں اخلاقی تعلیمات اور دوسرے شرعی احکام کے نزول سے قطع نظر صرف عقیدہ الوہیت پر زور دیا گیا ہے اور اس چیز کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہی بات اقرب الی النصوص ہے، جیسا کہ یہ بھی قرآن ہی سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی اکیس سورتوں میں نوے بار یا ایھا الذین آمنوا کے الفاظ سے اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام سورتیں اور آیتیں جمہور مفسرین کے نزدیک مدنی ہیں اور ان میں سے بیشتر آیات کے

تحت شرعی احکام بتائے گئے ہیں جب کہ مکی دور میں اس طرح کی ایک بھی آیت نازل نہیں ہوئی ہے بلکہ اس دور میں علامہ شیخ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب "نداءات الرحمان لاہل الایمان" قابل مطالعہ ہے، چنانچہ اس کتاب میں علامہ نے قرآن کی ان تمام آیات کو جمع کیا ہے جو یا ایھا الذین آمنوا کے خطاب سے شروع ہوتی ہیں، اس طرح قرآن کے اس اسلوب خطاب سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرعی احکام ہجرت نبوی کے بعد مدینہ میں نازل فرمائے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورہ شوریٰ کی آیت اقامت دین کا وہی مفہوم صحیح ہے جو جمہور علمائے سلف و خلف نے لیا ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر از سر نو غور کیا جائے اور اسے قرآن کی نزولی ترتیب کے ساتھ ساتھ علمائے سلف و خلف کی تفسیر و تعبیر اور تمام انبیائے کرام اور خاص کر پیغمبر اعظم و آخر حضرت محمد عربیؐ کے اسوۂ حسنہ اور سیرت طیبہ کو مدنظر رکھ کر ہی سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے بعد ہی اور اسی واحد صورت میں اپنے آپ اس آیت کا صحیح اور حقیقی مفہوم سمجھ میں آجائے گا، و ما علینا الا البلاغ۔

تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں

از:- ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

ہندوستان کے مسلم دور خصوصاً عہد سلطنت کی علمی و ثقافتی تاریخ مصنف کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے اور اس پر اردو اور انگریزی میں ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں، زیر نظر کتاب میں انہوں نے مسلم دور حکومت کی تعلیمی سرگرمیوں کا حال اور اس کی نمایاں خصوصیات دکھائی ہیں، یہ پانچ ابواب میں ہے، پہلے باب میں عہد سلطنت کے مدارس کا جائزہ لے کر ان کی نوعیت اور خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، دوسرے باب میں مسلم دور حکومت میں اعلا مرحلے کی تعلیم میں اختیار کیے جانے والے وسائل و ذرائع کا ذکر ہے اور تیسرے میں اس عہد کی درسیات میں جز و نصاب کتابوں کا تذکرہ ہے، آخر کے دو ابواب میں ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں عورتوں کی تعلیم کا حال اور مدارس کے قیام اور علم کی توسیع و اشاعت میں خواتین کی مساعی دکھائی گئی ہے، مسلم دور کی تاریخ کے طلبہ و محققین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔

قیمت: ۱۰۰/ روپے

مولانا عبدالماجد بدایونی

از:- ڈاکٹر شمس بدایونی ☆

بدایوں میں علوم وفنون کی روشنی گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے فوجی لشکر کے ساتھ پہنچی، ۱۲۰۲ء میں قطب الدین ایبک (ف ۱۲۱۰ء) کے قلعہ بدایوں فتح کر لینے کے بعد بدایوں بھی مسلم فرماں رواؤں کے زیر اقتدار آ گیا اور یہاں مسلم آبادکاری کا سلسلہ شروع ہوا، عہد شمسی میں بے شمار علما، صلحا اور صوفیا بلادِ عرب وعجم سے آ کر یہاں متوطن ہو گئے اور انہوں نے یہاں رشد و ہدایت اور علم وعمل کے چراغ جلائے، بایں سبب بدایوں ''قبۃ الاسلام''، ''مدینۃ الاولیا'' اور ''پیراں شہر'' کے نام سے معروف ہوا۔

بدایوں میں یوں تو مختلف سلسلہ ہائے طریقت کے بزرگوں نے فقر وتصوف، ایمان و ایقان، تعلیم وتعلم کے دیے روشن کیے لیکن گذشتہ دو صدیوں میں سلسلہ قادریہ یہاں کثرت سے مقبول ومروج ہوا، سلسلہ قادریہ کی نسبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (ف ۱۱۶۵ء) سے ہے، بدایوں میں یہ سلسلہ مارہرہ کے بزرگ حضرت شاہ برکت اللہ بلگرامی ثم مارہروی (ف ۱۷۲۹ء) کے توسط سے جاری ہوا، خاص شہر بدایوں میں حضرت شاہ عبدالمجید قادریؒ (ف ۱۸۴۶ء) اس سلسلے کے بانی قرار پائے، جنہوں نے مارہرہ سے اجازت وخلافت حاصل کر کے بدایوں میں خانقاہ قائم کی اور رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیا، شاہ عبدالمجید سے تاحال یہ خانقاہ قائم ہے، جو ''درگاہ قادریہ'' کے نام سے موسوم ہے، اس خانقاہ کے بزرگوں کی کئی سو سالہ علمی تاریخ ہے، ہمارے ممدوح مولانا عبدالماجد قادری بدایونی کا تعلق اسی سلسلے اور خاندان سے ہے، جو ''عثمانی علما'' کا خاندان کہلاتا ہے، یہ وہی خاندان ہے جس کے علما نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف و

☆ نیو آزاد پورم کالونی، چھاؤنی اشرف خاں، عزت نگر، بریلی - ۲۴۳۱۲۲۔

احفاد کی تحریک احیائے دین کے ظہور وشیوع کے دوران اعتقادیات اور بعض فروعی مسائل میں اختلاف کر کے ایک علاحدہ ''سنی مسلک'' کی بنا ڈالی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حسب ذیل بیان کا اطلاق بدایوں کی حد تک اسی خاندان کے علما اور ان کے متبعین پر ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''تیسرا فریق وہ تھا جو شدت کے ساتھ اپنی قدیم روش پر قائم رہا اور اپنے کو اہل السنہ کہتا رہا، اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور بدایوں کے علما تھے''۔
(مقدمہ حیات شبلی، ص ۴۶)

جدید سنی مسلک: یہ بات ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ اس ''جدید سنی مسلک'' کا تعلق اول اول بدایوں ہی سے تھا اور اس مسلک کے بانی ومبانی عثمانی خاندان ہی کے علما تھے جنہوں نے شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے متبعین سے تقریری وتحریری مناظرے کر کے اس تحریک کو ''نجدی تحریک'' کے مشابہ قرار دیتے ہوئے تکفیر کی حدود میں لا کھڑا کیا تھا (۱)، مولانا احمد رضا خاں (۱۸۵۸-۱۹۲۱ء) کے منصۂ شہود پر آ جانے کے بعد یہ حدود بھی توڑ دی گئیں اور یک قلم تمام علمائے دیوبند کی تکفیر کر دی گئی جو ولی اللٰہی فکر کے علم بردار تھے، اس ماحول میں ان کے فعال اور متحرک قلم نے سنی مسلک کی تشہیر وتبلیغ کی اور بالآخر یہ مسلک ''مسلک اعلاحضرت''، ''بریلوی مسلک'' یا ''مسلک اہل السنّت والجماعت'' کے نام سے موسوم ہو گیا۔

ہمارے ممدوح مولانا عبدالماجد بدایونیؒ عثمانی خاندان کے چشم وچراغ تھے، اسی خانوادے میں پلے بڑھے، اسی میں تعلیم وتربیت پائی اور اسی خانوادے سے بیعت وخلافت حاصل کی لیکن خانوادے کے اصولوں اور ضابطوں، تعلیم اور طریقوں سے انہوں نے کیا کام لیا، ان کے ہم نام مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی زبانی سنیے، وہ لکھتے ہیں:

''مرحوم بدایوں کے مشہور ومعزز پیرزادوں کے خاندان سے تھے، ناز و نعمت میں پرورش پائے ہوئے ابتدا سے خاصی امیرانہ زندگی کے خوگر، خوش پوشاک، خوش خوراک، دوسروں کو کھلا کر کھانے والے، تحریک خلافت میں شریک ہوتے ہی سارا معیار زندگی بدل دیا اور معاشرت بالکل سادہ بلکہ مفلسانہ کر لی ...... بڑے زبردست، خوش عقیدہ صوفی تھے، قادریت تو حد توغل تک

پہنچی ہوئی، ہر بزرگ کے ادب شناس، اکابر چشتیہ کے حلقہ بگوش، بزرگان دیو بند
سے صاف نہ تھے لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے پوری طرح معتقد، بڑے ذہین،
بڑے ذکی، بڑے شوخ وطباع ...... سو وصفوں کا ایک وصف یہ تھا کہ جس سے ملتے
کھل کر ملتے''۔ (ہم نام نامور، سچ لکھنؤ، ۲۵ردسمبر ۱۹۳۱ء)

مولانا ماجدؒ علمائے دیو بند سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کی تکفیر سے احتراز اور ان کے احترام وادب میں فروگذاشت نہ کرتے تھے، ان کے بھائی مولانا عبدالحامد (۲) قادری نے لکھا ہے:

''مجلس خلافت کا نظام جب پوری قوت کے ساتھ ہندوستان میں قائم ہوگیا تو مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالماجد بدایونی، نواب محمد اسماعیل خاں اور مجلس خلافت نے فیصلہ کیا کہ مجلس خلافت کی طرف سے تمام علما اور خاص طور پر علمائے دیو بند کو تحریک میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے، ایک وفد زیر صدارت مولانا عبدالماجد بدایونی ترتیب دیا گیا جو دارالعلوم دیو بند جاکر وہاں کے علما کو شرکت کی دعوت دے، چنانچہ مولانا عبدالماجد، نواب محمد اسماعیل خاں، سید محمد حسین بیرسٹرایٹ لا سکریٹری پراونشل خلافت کمیٹی پر مشتمل دیو بند پہنچا، جہاں شمس العلما مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیو بند سے ملاقات کی، مولانا عبدالماجد صاحب نے دارالعلوم کی عمارت میں علما اور طلبہ کی موجودگی میں ایک تاریخی خطبہ دیا جس میں علمائے دیو بند سے کہا گیا کہ وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ علمائے دیو بند تحریک خلافت میں شامل ہوں اور متحد طور پر تمام علما مل کر کام کریں، ارکان وفد نے بھی تقاریر کیں اور مفصل مذاکرات ہوئے مگر مولانا محمد احمد صاحب تیار نہ ہوئے''۔ (مولانا جوہر اور ماجد برگ گل ''جوہر نمبر''، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۳۸)

اس واقعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا ماجد علمائے سلف کی طرح غیر متشدد، صلح جو اور عمل بالایمان پر یقین رکھنے والے بزرگ تھے، قومی وحدت پر ہر اختلاف کو قربان کر دیتے

تھے، مسلکی عصبیت وتنگ نظری کو قوموں کے عروج میں رکاوٹ تصور کرتے تھے، ضرورت ہے کہ ان کی زندگی کے ایسے واقعات کو آج مشتہر کیا جائے۔

مولانا ماجد کے حالات وکوائف پردۂ خفا میں ہیں، راقم الحروف چوں کہ ان کا ہم وطن ہے، لہذا بعض مقامی ماخذ تک رسائی ممکن ہوسکی اور مصدقہ حالات قلم بند کرنے کی صورت پیدا ہوگئی، جنھیں سطور ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا عبدالماجد کا خاندان اور تعلیم: (مولانا) عبدالماجد ولد (مولانا) عبدالقیوم (۳) ساکن مولوی ٹولہ، عثمانی خاندان میں ۴رشعبان ۱۳۰۴ھ/ ۲۸راپریل ۱۸۸۷ء کو پیدا ہوئے، (تذکرۂ طیبہ، ص ۱۱، تذکرۃ الواصلین، ۲۶ حاشیہ) مولانا عبدالقادر بدایونی ملقب بہ تاج الفحول (ف ۱۹۰۰ء) کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی، رسم تسمیہ خوانی کے بعد مولانا عبدالمجید قادری آنولوی (ف ۱۹۴۲ء) اور مفتی شاہ محمد ابراہیم قادری (ف ۱۹۵۶ء) سے تعلیم حاصل کی، درس نظامی کی تکمیل مولانا محب احمد قادری (ف ۱۹۲۲ء) کے ہاتھوں ہوئی، اس درمیان شاہ عبدالقادر اور اپنے والد مولانا عبدالقیوم کے بھی حلقہ درس میں شامل رہے (مردان خدا، ص ۵۱۶)، ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۲ء میں درس نظامی کی تکمیل کی، اسی سال مولانا ابرار الحق کیف بدایونی (ف ۱۹۱۳ء) تلمیذ داغ کی صاحب زادی سے عقد کیا، تھوڑے وقفہ کے بعد طب کی تحصیل کے لیے دہلی گئے، حکیم غلام رضا خاں اور حکیم عبدالرشید خاں سے طب کی تکمیل کی، ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں طب کی سند حاصل کی، دہلی میں قیام کے دوران آریہ سماجیوں اور قادیانیوں سے مناظرے بھی کیے۔ (تذکرۂ طیبہ، ص ۱۳)

طالب علمی کے دوران مولانا عبدالمقتدر قادریؒ (ف ۱۹۱۵ء) کے دست پر بیعت ہوئے اور خلافت کے مجاز قرار دیے گئے۔

خطابت میں کمال: وہ اپنے دور کے بے مثال خطیب، مصنف، شاعر اور ملی رہنما تھے، ان کی مثلث حیات کے تین زاویے رہے، علم وادب، تصوف اور سیاست، خطابت میں ان کا دور دورشہرہ تھا، سیرت رسول، شہادت حسین، مجالس میلاد النبی، سیاست حاضرہ پر لاجواب تقریریں کرتے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے لکھا ہے:

''لکھتے اچھا تھے، متعدد رسائل ومضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں لیکن

جیسا لکھتے تھے اس سے کہیں بہتر بدرجہا بہتر بولتے تھے، تقریر اور موثر تقریر ہر موضوع پر کر سکتے تھے اور سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر دلوں کو ہلا دیتے اور مجلسوں کو لٹا دیتے تھے لیکن اصلی ذوق اور فطری شوق کی چیز محفل میلاد تھی، حبیب رب العالمین کا ذکر پاک کرنے کو اٹھتے تو آپ میں نہ رہتے، بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے، خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی اور خوش بیانی مست ہو ہو کر منہ چومتی، ایک ایک فقرہ معلوم ہوتا تھا کہ عشق و محبت کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور ایک ایک جملہ نظر آتا تھا کہ سوز و گداز کے عطر میں بسا ہوا نکلتا چلا آرہا ہے، فصاحت و بلاغت کا ایک دریا تھا کہ ابلا پڑتا ہے"۔

(ہم نام نامور، سچ، ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء)

مولانا سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) نے انہیں "خطیب الامت" کا لقب دیا تھا، ضیا علی خاں اشرفی لکھتے ہیں:

"تقریر بے نظیر کرتے، تقریر کے دوران عمامے کے بل کھل جاتے اور عبا کے دامن ہوا میں لہرانے لگتے تھے، سامعین پر عجیب و غریب کیفیات طاری ہو جاتی تھیں، جلسہ کبھی کشت زعفران بن جاتا اور کبھی مجلس عزا، کبھی قہقہے لگنے لگتے کبھی آہ و بکا کا شور ہوتا"۔ (مردان خدا، ص ۵۱۷)

نعت کے معروف شاعر ضیاء القادری (ف ۱۹۷۰ء) نے ان کی خطابت کی خصوصیات اور واقعات پر مشتمل ۳۰۴-اشعار کی ایک مثنوی باسم تاریخی "مشق تقریر" (۱۳۵۰ھ) لکھی تھی، جس کے چند شعر یہاں درج کر دینا ضروری سمجھتا ہوں:

لیے بوسے خطابت نے زباں کے — کھلے دفتر معانی و بیاں کے
حقائق وجد میں آ آ کے جھومے — بلاغت نے لب اعجاز چومے
قبائے ناز کے لہرائے آنچل — عمامے کے ادھر کھلنے لگے بل
عجب سج دھج تھی انداز بیاں کی — زبانیں گنگ تھیں اہل زباں کی
کسی جانب تھا جوش بے قراری — کسی جانب تھا شور آہ و زاری

کہیں تھا بے خودی میں لب پہ یا ہو — کسی کی آنکھ سے جاری تھے آنسو
کہیں تھا یا رسول اللہ لب پر — کہیں تھا نعرہ اللہ اکبر
بیاں حیرت سے کوئی سن رہا تھا — کوئی مدہوش تھا سر دھن رہا تھا

(تذکرہ طیبہ، ص ۵۷)

مذکورہ بیانات مولانا ماجد کی تقریر کی لذت و حلاوت اور اثر پذیری کو ظاہر کرتے ہیں، اس دور کی تمام مذہبی اور سیاسی جماعتوں نے ان کے ملکہ خطابت سے فائدہ اٹھایا، سید حسن ریاض نے ان کی خطابت پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جو تواریخ وصل و انتقال (لکھنؤ ۱۹۳۱ء) بھی شامل ہے، رئیس احمد جعفری کی کتاب "اوراق گم شدہ" میں ان کی چند تقاریر کے حصے محفوظ ہو گئے ہیں۔ (۴)

ملی و سیاسی سرگرمیاں: ملکی و ملی اور سیاسی سرگرمیوں اور جماعتوں میں بھی انہوں نے بیش از بیش حصہ لیا، مجلس خدام کعبہ (۱۹۱۲ء)، خلافت کمیٹی (۱۹۱۹ء)، جمعیۃ العلما (۱۹۱۹ء)، ترک موالات (۱۹۲۰ء)، تبلیغ (۱۹۲۲ء)، تنظیم (۱۹۲۴ء)، مسلم کانفرنس (۱۹۲۹ء) ہر ایک تحریک میں ایک فعال کارکن، مشیر خصوصی، مخلص کارگزار اور اس تحریک کے مبلغ و واعظ کے طور پر شریک رہے، مدتوں صوبہ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے اور انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر بھی، (سچ ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء) خلافت کمیٹی کے دو اجلاس - اجلاس ناگپور منعقدہ ۱۹۲۰ء اور اجلاس بمبئی منعقدہ ۱۹۳۱ء کی صدارت بھی کی۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۲۰۲، ۲۰۱)

ان کی زندگی کا ہر لمحہ قومی زندگی کے لیے وقف تھا، شبانہ روز سفر میں رہتے تھے اور ملک کے طول و عرض میں مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے، علما کو متحد کرنے، ان کی ذمہ داریوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں قومی پلیٹ فارم پر بے شمار خطبے دیے اور تقریریں کیں، اس سلسلے میں بعض اسلامی ممالک کی سیاحت بھی کی، ۱۹۲۴ء میں مجلس خلافت نے ابن سعود اور شریف حسین تنازعہ طے کرانے کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) کی قیادت میں ایک وفد حجاز بھیجا تھا، اس وفد کے ارکان میں مولانا ماجد بھی شامل تھے (۵)، (علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت و ادبی خدمات، ص ۸۰)، مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے:

"جس تحریک میں شریک ہوئے دل و جان، شغف و انہماک، مستعدی

دسرگرمی سے شریک ہوئے، جس کام کو ہاتھ لگایا اس میں جان ڈال دی، زندگی کے آخری گیارہ، بارہ سال کا ہر گھنٹہ بلکہ کہنا چاہیے ہر منٹ قومیات کے لیے وقف تھا"۔ (سچ، ۲۵/ دسمبر ۱۹۳۱ء)

علم دین کے فروغ کے لیے سعی و جہد: علم دین کے فروغ اور انسان کی روحانی و ذہنی تربیت کے لیے بھی انہوں نے غیر معمولی کوششیں کیں، ۱۱/ صفر ۱۳۱۷ھ / ۲۲/ جون ۱۸۹۹ء کو جامع مسجد شمسی (بدایوں) میں ان کے والد مولانا عبدالقیوم نے ندوۃ العلما لکھنؤ (مئی ۱۸۹۸ء) کے قیام کے بعد "مدرسہ شمسیہ" کی بنا ڈالی، مولانا کے والد "تحریک ندوۃ العلما" کے مخالفین میں تھے اور اس تحریک کے دفاع کے لیے انہوں نے قبل ۱۸۹۸ء "مجلس علمائے اہل سنت" قائم کی تھی، مدرسہ شمسیہ کا قیام بھی مجلس علمائے اہل سنت کے منصوبے کا ایک حصہ تھا جس کے افتتاحی جلسے میں مولانا احمد رضا خاں، سید شاہ عبدالصمد سہسوانی (ف ۱۹۰۶ء)، مولانا وصی احمد محدث سورتی وغیرہ نے شرکت کی، لیکن مدرسہ کی ترقی مولانا کے والد کی اگلے سال ۱۹۰۰ء میں وفات پا جانے کے بعد ختم ہوگئی (تذکرۂ طیبہ، ص ۱۴)، بعد میں اس مدرسہ کی آبیاری مولانا ماجد کے ہاتھوں ہوئی، انہوں نے منتخب اساتذہ جمع کیے، ہم دردانِ قوم سے زر کثیر جمع کر کے مدرسہ کے لیے علاحدہ ایک دو منزلہ عمارت تعمیر کرائی، انگریز کلکٹر مسٹر انگرام نے ۳/ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ / ۲۸/ جنوری ۱۹۱۷ء کو اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا، مولوی ظہور حسن ٹونک والا (ف ۱۹۳۹ء) نے بلند و بالا دروازہ تعمیر کرایا جسے گھنٹہ گھر کی صورت دے دی گئی، عمارت سے فاصلے پر ایک دارالاقامہ تعمیر کرایا، ۱۹۳۴ء میں یہ جدید عمارت مکمل ہوگئی اور مسجد سے مدرسہ اس جدید عمارت میں منتقل ہوگیا، یہ عمارت گھنٹہ گھر کی صورت میں آج بھی شہر کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی ہے۔ (ہست و بود، ص ۱۸۷، ۱۸۸، تذکرۂ طیبہ، ص ۲۰)

مدرسہ میں تعلیم کے معیار کو بلند کیا گیا، درس نظامی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مولوی، عالم، فاضل، منشی وغیرہ کے امتحانات جاری کیے، ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے:

"جلد ہی مدرسہ شمس العلوم نے ملک کی دینی درس گاہوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا، ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں سے طلبہ تحصیل علم کے لیے

آنے لگے، لائق اور محنتی علما بہ حیثیت مدرسین اور اساتذہ مدرسہ سے وابستہ ہوگئے، دستار بندی کے موقع پر نہایت شان دار جلسے منعقد ہوتے، ان جلسوں میں تمام ہندوستان کے ممتاز اور مشہور علمائے کرام شریک ہوتے، بعض رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سلیمان اشرف (علی گڑھ)، مولانا نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمان خاں شروانی (بھیکم پور)، مولانا ہادی علی خاں (سیتاپور)، مولانا محمد فاخر (الہ آباد)، مولانا اسرار الحق طوطی ہند، مولانا سراج احمد شاہ جہاں پوری (آنولہ)، مولوی رحیم بخش قادری (آنولہ)، مولانا غلام قطب الدین برہم چارلی (سہسوان) وغیرہ ان جلسوں میں شریک ہوئے"۔ (مجلہ بدایوں، کراچی، مئی ۱۹۹۶ء، ص ۴۸)

مدرسہ میں تعلیمی ماحول بنانے کے لیے لائبریری اور ایک ماہنامہ شمس العلوم (اجرا ستمبر ۱۹۱۴ء) جاری کیا، یہ ماہنامہ مطبع قادری بدایوں سے شائع ہوتا تھا اور دینی علوم پر معیاری مضامین پیش کرتا تھا، ۱۹۳۱ء میں مولانا کی وفات کے ساتھ یہ رسالہ بھی مرحوم ہوگیا۔

مدرسہ میں مطبع قادری کے نام سے ایک دارالاشاعت بھی تھا جس سے مولانا ماجد کے علاوہ دوسرے مصنفین کی کتابیں بھی مختلف اوقات میں شائع ہوتی رہیں، بعض مطبوعہ اہم کتب یہ ہیں: زبدۃ الآثار و زبدۃ الاسرار (شیخ عبدالحق محدث دہلوی)، سیف الجبار، البوارق المحمدیہ (مولانا شاہ فضل رسول)، اکمل التاریخ دو جلد (ضیاء القادری)، الحدوث والقدم، التناسخ (مولانا محب احمد) وغیرہ۔

مدرسہ کو ریاست رام پور اور حیدرآباد سے امداد بھی ملتی تھی جو ۱۹۴۷ء کے بعد بند ہوگئی، مدرسہ آج بھی قائم ہے لیکن مدرسہ کا معیار کیا ہے، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔

مولانا ماجد کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا، تلمذ کے متعلق علم نہ ہوسکا، ایک زمانے میں درگاہ قادریہ میں "عرس قادریہ" کے تحت مناقب خوانی کی مستقل ایک مجلس آراستہ کرتے تھے اور نعت و مناقب کا زوردار اہتمام کرتے، خود بھی ان مجالس میں کلام پیش کرتے، منظور تخلص فرماتے تھے، کلام نایاب ہے۔

تصانیف: متعدد رسائل یادگار چھوڑے، مطبوعہ رسائل کے نام یہ ہیں (۶):

۱- دربار علم، ۲- کشف الحقیقت مالابار، ۳- سمرنا کی خونی داستان، ۴- عورت اور قرآن، ۵- خلاصہ فلسفہ، ۶- خلاصۃ العقائد، ۷- خلاصۃ الاسلامیہ، ۸- خلاصۃ المنطق، ۹- خلافت الٰہیہ (حصہ اول تاریخ خلافت)، ۱۰- خلافت نبویہ (حصہ دوم تاریخ خلافت)، ۱۱- فلاح الدارین، ۱۲- الاظہار، ۱۳- المکتوب، ۱۴- فصل الخطاب، ۱۵- درس خلافت، ۱۶- اعلانِ حق، ۱۷- جذبات الصداقت، ۱۸- التجدید، ۱۹- القول السدید، ۲۰- جواز عرس، ۲۱- خطبات عربیہ جمعہ وعیدین۔ (تذکرۂ طیبہ، ص ۲۰)

۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء میں مسئلہ اذان وخطبہ ثانیہ پر مولانا احمد رضا خاں بریلوی (ف ۱۹۲۱ء) اور المتقادیات میں مولوی ابوالقاسم بنارسی کے چند رسائل کے رد بھی لکھے (تذکرۂ طیبہ، ص ۲۰)، کچھ مدت تک مولانا احمد سعید دہلوی (ناظم جمعیۃ العلما) سے بھی تحریری وتقریری کشمکش جاری رہے۔ (سچ لکھنؤ، ۲۲ر نومبر ۱۹۲۹ء)

اتنی کثیر الجہت علمی وادبی اور ملی خدمات انجام دے کر ۳ر شعبان ۱۳۵۰ھ/ ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو واصل بحق ہوئے، مزار درگاہ قادریہ کے جنوبی دالان میں پختہ واقع ہے۔ (تذکرہ طیبہ، ص ۳۳، مردان خدا، ص ۵۱۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی (ف ۱۹۷۷ء) نے ان کی وفات پر ”ہم نام ناموَر“ کے عنوان سے ماتمی مضمون لکھا، (سچ ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء)، مولانا سید سلیمان ندوی (ف ۱۹۵۳ء) نے ”خطیب الامۃ مولانا عبدالماجد بدایونی کے عنوان سے ”معارف“ میں ماتمی مرثیہ لکھا، بدایوں کے متعدد شعرا نے مرثیوں، قصیدوں اور قطعات کی صورت میں ان کو خراج تحسین پیش کیا، اس سلسلے کی کتابیں حسب ذیل ہیں:

۱- تواریخ وصل وانتقال (قطعات) شائع کنندہ: محمد اسرار الحق قادری، ادبی پریس لکھنؤ، ۱۹۳۱ء (تاریخی قطعات کے علاوہ مولانا دریابادی، مولانا سلیمان ندوی اور سید حسن ریاض ایڈیٹر ہمت (بلند شہر) کے تین مضامین بھی شامل ہیں)۔

۲- پارہ ہائے جگر (۳۱- بند کا مسدس) نتیجہ فکر: تولا حسین تولا بدایونی، ادبی پریس لکھنؤ ۱۹۳۱ء۔

۳- روداد دل خراش (۲۱۳- ابیات کا مرثیہ) نتیجہ فکر: ضیاء القادری مشمولہ تذکرہ طیبہ، بدایوں ۱۹۳۲ء۔

۴- نغمہ ہجر (نظم) محبوب الحسن ارشدی بدایونی، عثمانی پریس بدایوں ۱۹۳۷ء۔

پس ماندگان میں مولانا نے دو بیٹے عبدالواجد قادری اور مولانا عبدالواحد قادری کے علاوہ دو ناکتخدا بیٹیاں طاہرہ فرید اور ظاہرہ خاتون اور بیوہ یادگار چھوڑیں۔

مولانا ماجد کی مذہبی وملی کارگزاریاں ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہیں لیکن یہ تمام کارگزاریاں بکھرے واقعات، منتشر کوائف، بے ترتیب اشاروں اور حوالوں کی صورت میں جہاں تہاں نظر آتی ہیں، ان کو جب تک ریزہ ریزہ جمع نہیں کیا جائے گا مولانا کی شخصیت کے صحیح خدوخال ابھر کر سامنے نہیں آسکیں گے۔ ۱۹۴۴ء میں ماہنامہ ”مجلہ بدایوں“ کراچی نے اپنی ایک اشاعت (اپریل ۱۹۹۴ء) کو مولانا ماجد سے مخصوص کر کے شائع کیا تھا لیکن اس میں پیش کردہ مواد مولانا سے متعلق دست یاب معلومات ومواد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں کر سکا، برادرم تسلیم غوری نے ان کی حیات وخدمات پر ایک کتاب ترتیب دی ہے، اس کی نوعیت ترتیب سے ناواقف ہوں، یہ منتظر اشاعت ہے، ضرورت ہے کہ ہماری جامعات کے اردو شعبے ان کی جانب توجہ کریں اور ان پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھوا کر ایک اہم ضروری علمی فریضے کی تکمیل کریں۔

حواشی

(۱) مولوی عبدالمجید قادری (ف ۱۸۴۶ء) نے شاہ اسماعیل شہید (ف ۱۸۳۱ء) کی زندگی ہی میں ”تقویۃ الایمان“ کے رد میں ”ہدایت الاسلام“ کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا (اکمل التاریخ، ج ۱، ص ۱۱۰)، مولوی عبدالمجید کے بیٹے مولانا فضل رسول مست بدایونی (ف ۱۸۷۲ء) اور ان کے بیٹے مولانا عبدالقادر قادری (ف ۱۹۰۱ء) نے شاہ اسماعیل شہید کی کتب اور نظریات کا تحریری بطلان کیا، مولانا فضل رسول پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی کتاب سیف الجبار (اردو سال تالیف ۱۲۶۵ھ/ ۴۹-۱۸۴۸ء، مطبوعہ مطبع صبح صادق سیتاپور، ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء) میں شاہ اسماعیل شہید اور شیخ محمد بن عبدالوہاب (نجدی) کے درمیان فکری رابطے تلاش کیے اور اسی نسبت سے شاہ صاحب پر لفظ ”وہابی“ کا اطلاق کیا، ہندوستان کی تاریخ میں لفظ ”وہابی“ کا غالباً یہ اولین استعمال تھا جو بعد

میں خاندان ولی اللّٰہی کے دوسرے اکابر و جانشینوں پر بھی (جو برطانوی ہند کو دارالحرب کہتے تھے اور جہاد کو جائز قرار دیتے تھے) چسپاں کیا جانے لگا، انگریز مورخین نے اس لفظ کو باغی کے معنوں میں استعمال کیا اور تحریک احیائے دین کو وہابی سوومنٹ کا نام دے دیا، انگریز مصنفین میں سب سے پہلے لفظ ''وہابی'' کا استعمال ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے اپنی کتاب آور انڈین مسلمانز (OUR INDIAN MUSALMANS) مطبوعہ ۱۸۷۱ء) میں کیا تھا لفظ وہابی (۱۷۴۴ء سے ۱۸۰۳ء کے درمیان) اہل عرب یا ترکوں نے وضع کیا، آل سعود اور محمد بن عبدالوہاب کی مشترکہ سیاسی و مذہبی تحریک کے شریف مکہ اور سلطنت عثمانیہ کو ان کے بالمقابل کھڑا کر دیا تھا، اس دوران مذہبی مناظرے رسائل کی اشاعت اور فوجی معرکے جاری رہے، محمد بن عبدالوہاب کی برپا کردہ توحید خالص اور اس کے اثر کے تحت آل سعود کا بہ صورت حکمراں ظہور و فتوحات حاصل کرنا ترکوں کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، چنانچہ نفرت انگیز سیاسی پروپیگنڈے کے طور پر ان کے ہم نوا اور متبعین کو ''وہابی'' کے لقب سے مطعون کیا گیا، شیخ عمران نے کہا ہے:

ان کان تابع احمد متوهباً فانا المقر باننی وهابی

ترجمہ: اگر احمد ﷺ کا پیروکار وہابی ہے تو مجھے اقرار ہے کہ میں وہابی ہوں۔

انہیں دنوں بریلی میں مولانا محمد احسن نانوتوی (۱۸۲۵-۱۸۹۵ء) ولی اللّٰہی افکار و خیالات کی نشر و اشاعت کر رہے تھے، انہوں نے ستمبر ۱۸۶۲ء سے قبل بریلی میں مطبع صدیقی قائم کیا اور اس مطبع سے شاہ صاحب اور ان کے متبعین کی کتب کی اشاعت کی (مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۶۸) بریلی ہی سے ۱۷: ستمبر ۱۸۶۲ء کو ایک ہفتہ وار اخبار ''احسن الاخبار'' جاری کیا، مطبع صدیقی اور احسن الاخبار کے مالک و مدیر مولانا خود ہی تھے، (اختر شہنشاہی، ص ۱۴) مولانا نے ۱۸۷۲ء میں ''مصباح التہذیب'' (مصباح العلوم) کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اگر بریلی اور دیوبند کے درمیان اختلاف کا نقطۂ آغاز تلاش کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ دراصل اختلاف کی ابتدا مولانا احمد رضا خاں سے پہلے ان کے والد مولانا نقی علی خاں (۱۸۳۰-۱۸۸۰ء) اور مولانا احسن نانوتوی کے درمیان اثر ابن عباس کی صحت اور اس کے نتیجہ میں مولانا احسن کی علانیہ تکفیر سے ہوئی تھی، تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ تھا جس کی تردید اور دفاع علمائے فرنگی محل اور علمائے دیوبند نے پرزور طریقے پر کیا، یہی بحث دراز ہو کر مولانا احمد رضا خاں تک پہنچی، اس سلسلے کے فریقین کے رسائل کا تعارف

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنی کتاب ''احسن نانوتوی'' میں کرا دیا ہے۔

(۲) یہ مولانا ماجد کے چھوٹے بھائی تھے (۱۸۹۸-۲۱/ جولائی ۱۹۷۰ء) تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں بھی ان کی سیاسی و ملی خدمات جاری رہیں، ۱۹۵۳ء میں انہوں نے تحریک ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، دو قومی نظریے کے حامی تھے، قرارداد لاہور کے موید رہے، جمعیۃ علمائے پاکستان کے بنیاد گزاروں میں بھی ان کا نام لیا جاتا ہے، ان کی تصانیف میں (۱) اسلام کا زراعتی نظام عمل (۲) اسلام کا معاشی نظام اور سوشلزم (۳) کتاب و سنت غیروں کی نظر میں (۴) حرمت سود (۵) عائلی قوانین (۶) مشرق کا ماضی و حال (۷) فلسفہ عبادات اسلامی (۸) رپورٹ دورہ کشمیر وغیرہ قابل ذکر ہیں، حکومت سندھ نے ان کے نام پر ایک کالج قائم کر دیا ہے، اسی کالج کے احاطے میں ایک بلند ٹیلے پر مدفون ہیں۔

(۳) مولانا عبدالقیوم (ف ۱۹۰۰ء) بیٹے ہیں حافظ مرید جیلانی (ف ۱۸۸۰ء) کے اور جیلانی بیٹے ہیں مولانا محی الدین (ف ۱۸۵۴ء) کے اور محی الدین بیٹے ہیں شاہ معین الحق مولانا فضل رسول مست قادری (ف ۱۸۷۲ء) کے۔

(۴) مجلہ بدایوں، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۴ء۔

(۵) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

''مرحوم نے عراق کا سفر اپنے بزرگوں کے ساتھ کیا تھا اور حجاز و مصر کا سفر میرے ساتھ ۱۹۲۵ء میں کیا، بے گوش تو وہ تھے ہی مگر ان جیسا بے زبان رفیقِ سفر ملنا بھی ممکن نہیں''۔ (بحوالہ مجلہ بدایوں، کراچی اپریل ۱۹۹۴ء)

حجاز کے سفر کا صحیح سال ۱۹۲۴ء تھا یا ۱۹۲۵ء، یہ تحقیق طلب ہے۔

(۶) مولانا ماجد کے مطبوعہ رسائل ''میرے مطالعہ میں رہے ہیں لیکن سر دست یہ دست رس میں نہیں، لہٰذا ان کے متعلق تعارفی کلمات لکھنے سے بھی محض اس لیے احتیاط برتی جا رہی ہے کہ کہیں حافظہ کی غلطی ان کی سوانح کی مستقل غلطی نہ بن جائے۔

کتابیات

اختر شہنشاہی، سید محمد اشرف نقوی، مطبع اختر پریس لکھنؤ، ۱۸۸۸ء۔

اکمل التاریخ ج ۱/، محمد یعقوب ضیاء القادری، مطبع قادری بدایوں، ۱۹۱۵ء۔

بدایوں ضلع کا ہست و بود، ضیاء علی خاں اشرفی، بریلی الکٹرک پریس بریلی، ۱۹۸۷ء۔

تذکرہ ماہ و سال، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۱۹۹۱ء۔

تذکرہ طیبہ، ضیاء القادری، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۲ء۔

تذکرۃ الواصلین (بار دوم)، محمد رضی الدین بسمل، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۴۵ء۔

حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڈھ، ۱۹۴۳ء۔

شعرائے بدایوں دربار رسول میں، شمس بدایونی، ڈان پرنٹنگ پریس کراچی، (طبع دوم) ۱۹۹۷ء۔

علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت و ادبی خدمات، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، مکتبہ فردوس لکھنؤ، ۱۹۸۵ء۔

مردان خدا (طبع سوم)، ضیاء علی خاں اشرفی، بریلی الکٹرک پریس بریلی، ۱۹۹۰ء۔

مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل احمد منگلوری، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۸ء۔

مولانا محمد احسن نانوتوی، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی، ۱۹۶۶ء۔

برگ گل سالانہ میگزین عبدالحق کالج، (مولانا محمد علی جوہر نمبر) کراچی ۱۹۸۰ء۔

سچ ہفتہ وار لکھنؤ ۲۲ نومبر ۱۹۲۹ء۔

سچ ہفتہ وار (ہم نام نام ور از عبدالماجد دریابادی) لکھنؤ، ۲۵ دسمبر ۱۹۳۱ء۔

مجلہ بدایوں ماہنامہ، مدرسہ شمس العلوم بدایوں از ڈاکٹر محمد ایوب قادری، کراچی، مئی ۱۹۹۶ء۔

مجلہ بدایوں ماہنامہ، (ماجد نمبر)، کراچی، اپریل ۱۹۹۴ء۔

قدیم عربی نثر

ڈاکٹر محمد یوسف خاں☆

عربی زبان و ادب اپنے علمی خزانہ اور شعر و ادب کے گراں مایہ ذخیرہ کی وجہ سے دنیا کی تمام زبانوں میں غیر معمولی قدر و قیمت کی حامل ہے، اس کے علوم و فنون کا اثر مشرق و مغرب دونوں پر یکساں پڑا۔

تاریخ ادب عربی کے اولین دور کو ہم جاہلی دور کے نام سے جانتے ہیں، یہ دور پانچویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر ہجرت رسولؐ پر ختم ہو جاتا ہے، جاہلی دور کی نثر شاعری کے مقابلہ میں ہم تک کم پہنچی ہے لیکن جو بھی نمونے ملتے ہیں وہ جامعیت اور اثر پذیری کے اعتبار سے ادب کا قیمتی سرمایہ قرار دیے جاسکتے ہیں، اس دور کی نثر نگاری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱- زبانی نثر: خطبات، ضرب الامثال اور کہاوتیں، وصایا، فلسفیانہ مقولے اور قصے کہانیاں اس زمرہ میں رکھی جاسکتی ہیں، ان تمام اصناف میں دل کشی، تاثیر اور محکم ترسیل کی خوبیاں بہ درجۂ اتم موجود ہیں، قصوں کہانیوں میں خاص موضوع جنگ، شجاعت اور جواں مردی کی حکایتیں ہیں، عنترہ بن شداد، سیف بن ذی یزن اور اکثم بن صیفی اس دور کے نمائندہ ادبا ہیں۔

۲- تحریری نثر نگاری: اگرچہ تحریری نمونے کم ملتے ہیں لیکن اثری انکشافات سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اپنا تحریری سرمایہ کتبوں، دیواروں اور تختیوں وغیرہ پر مدون کیا تھا۔

تاریخ ادب کے دوسرے دور کا پہلا مرحلہ ۶۲۲ء سے ۶۶۱ء تک اور دوسرا مرحلہ ۶۶۱ء سے ۷۵۰ء تک یعنی اموی دور پر مشتمل ہے۔

قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کے عربی ادب پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کے نتیجے میں

☆ شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

عربی زبان کو لازوال اہمیت حاصل ہوگئی، قرآن مجید اپنے اسلوب میں منفرد ہے، اس میں جو فصاحت وبلاغت اور حسن وجمال ہے وہ بے نظیر ہے، اس کے اثر سے عربی زبان میں حسن اسلوب اور زورِ استدلال کی خوبیاں پیدا ہوئیں۔

حدیثِ رسولؐ کی زبان سادہ فصیح اور دل پذیر ہے، آنحضرتؐ کی فصاحت وبلاغت کا اثر صحابہ کرام کے کلام میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے، چنانچہ خلفائے راشدین کے خطبات اور ارشادات عربی زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں، اس دور کی زبان کے نمونے المبرد کی الکامل، جاحظ کی البیان والتبیین اور ابن عبدربہ کی العقد الفرید میں محفوظ ہیں۔

قرآن مجید ہی کی یہ دولت بہت سے علوم وجود میں آئے، علم تفسیر، اصول تفسیر، صرف ونحو، علم بیان، علم فقہ، علم فرائض، فن کتابت وغیرہ جیسے علوم قرآن ہی کا فیض ہیں اور حدیث سے وجود میں آنے والے علوم میں اصول حدیث، اسماء الرجال، تاریخ وسیرت نگاری جیسے علوم کو رکھا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عربی زبان کو قرآن وحدیث کی یہ دولت جو خصوصیات حاصل ہوئیں وہ اپنی اہمیت ونوعیت کے اعتبار سے منفرد ہیں، انسانی اخوت کا تصور، تعاون وتسامح، کرامت و نجابت، انسانیت کی فلاح وصلاح کا نظریہ قرآن ہی کا عطا کردہ ہے، صداقت وصراحت، اخلاص واخلاق وغیرہ صفات بھی قرآن مجید نے عطا کی ہیں، ابوتمام، متنبی، بحتری، جاحظ، غزالی اور ابن خلدون جیسے علما وادبا وشعرا کے اثرات عربی ادب میں گہرے اور مستحکم ہیں۔

قرآن وحدیث کے بعد خطبات وتوقیعات بھی عربی نثر کی ایک اہم قسم ہے، رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین کے خطبات، صداقت واخلاص اور صراحت کی صفات سے متصف اور اعلا درجہ کے فنی نمونے ہیں، حضرت علیؓ کے خطبات بالخصوص مواعظ، وصایا، حکمت وفلسفہ اور مشاہدات پر مبنی ہیں اور عربی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، ان خطبات میں سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی سب ہی عناوین شامل ہیں اور ان میں مستحکم اور پرکشش اسلوب میں گفتگو کی گئی ہے۔

توقیعات کی ابتدا خلفائے راشدین کے دور میں ہوئی اور اموی دور میں اس نے ادبی وفنی حیثیت سے خاص ترقی کرلی اور ان کو ادب کے زمرہ میں شمار کیا جانے لگا، توقیعات، ایجاز، بلاغت، معنی کی بلندی، قوت الفاظ اور موثر ادبی اسلوب کا نمونہ ہوتی ہیں، ناقدین نے توقیعات

کو دہکتے ہوئے انگاروں سے تعبیر کیا ہے جن کی لپٹ ہر شخص خواستہ وناخواستہ محسوس کرتا ہے۔

رسائل وتوصیات کا آغاز بھی رسول اللہؐ کے دعوتی خطوط سے ہوتا ہے، خلفائے راشدین میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، پھر حضرت امیر معاویہؓ اور آگے چل کر اموی دور میں اس صنف کو فنی حیثیت حاصل ہوئی، اموی دور میں اس کی فنی اور ادبی خوبیوں کی وجہ سے عربی نثر کو ایک نیا رجحان میسر ہوا، آہستہ آہستہ رسائل ووصایا کی فنی خوبی، حسن اور دل کشی بڑھتی گئی اور یہ دونوں نثر کی مستقل صنف کی حیثیت سے ارتقا پذیر ہوئے، عبدالحمید بن یحییٰ کے رسائل سے اس کے فنی کمال کا پتہ چلتا ہے۔

محاورات وقصص کا موعظت کے اسلوب میں آغاز ہوا جو شیرینی، صداقت، تحلیلی انداز اور منطقی اسلوب کا مرقع ہوتے ہیں، تیسری صدی ہجری میں جنید بغدادی کی القصد الی اللہ اور معالی الہمۃ، ابن ابی الدنیا کی امر بالمعروف والنہی عن المنکر، حارث بن اسد محاسبی کے رسالۃ المرشدین، شہاب الدین کی ملوک الممالک وغیرہ اہم کتب اس موضوع کی اولین تحریریں ہیں۔

عربی نثر کے ارتقا کا تیسرا دور ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء کے طویل عرصہ پر محیط ہے، اس دور کے نثری ادب میں جن اصناف کو فروغ حاصل ہوا، ان میں بڑا تنوع ہے، یونانی فلسفہ، ایرانی ادب اور ہندوستانی طب وریاضی وغیرہ اس کے موضوعات میں شامل ہوگئے، عباسی دور کی ہمہ جہت علمی ترقیات کی بنا پر اس کو سنہرا دور کہا جاتا ہے۔

عبدالحمید الکاتب نے فن رسائل کو جن خطوط پر ابھارا تھا، عباسی دور کے جاحظ نے ان کو مزید نمایاں کرکے انہیں جملہ خوبیوں سے مزین کردیا، اس دور کے نثری ادب میں وہ تمام علوم شامل ہیں جو اب تک عربی زبان میں وجود پاچکے تھے، اس دور کے ادب میں اتنی جامعیت آگئی کہ اس میں تمام علوم وفنون کا احاطہ ہوتا ہے اور اس مناسبت سے ادیب گویا علم وادب کا خزانہ ہوا کرتا ہے، تفسیر طبری، صحیح بخاری، موطا امام مالک، اس دور کے نثری سرمایہ میں قابل ذکر اضافے ہیں۔

ابن المقفع نے کلیلہ ودمنہ کو پہلوی زبان سے ترجمہ کرکے عربی نثر میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جس سے ایک خوش گوار اسلوب کی راہیں ہموار ہوئیں، اس کے ساتھ عربی نثر میں

بیانیہ فنون کو شعوری ادبی اسالیب کی شکل میں منظم کرنے کا عمل بھی شروع ہوا، قصص، سیرت، حکایت اور عرب سے متعلق قصوں کی ترتیب و تنظیم اسی دور میں شروع ہوئی، الف لیلۃ ولیلۃ اور پھر مقامات کا فن اس دور کے قصصی ادب کی نمایندگی کرتے ہیں، لسانی ولغوی موضوعات میں خلیل بن احمد کی العین، سیبویہ کی الکتاب اور ابوعبیدہ واصمعی کی تحریریں لائق ذکر ہیں۔

تیسری صدی ہجری سے نثر کا جوارتقا ہوا اس میں جاحظ ابن العمید اور قاضی فاصل کی کاوشوں کو اولین درجہ میں رکھا جاسکتا ہے، جاحظ نے اپنے زمانہ کے احوال کو رسائل کی شکل میں ایک اعلا اسلوب اور پرشکوہ طرز پر پیش کیا ہے لیکن چوں کہ یہ اسلوب جاحظ کا منفرد اسلوب تھا، اس لیے نمونہ نہیں بن سکتا تھا، لہذا بعد کے ادبا نے ایک دوسرے اسلوب کی بناڈالی جو جاحظ سے مختلف ہے۔

ابوالفرج اصبہانی کی الاغانی میں واقعیت، رنگارنگی اور سرعتِ تاثیر کی خوبیاں بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہیں، اسی طرح تمثیلی منظر کشی، منظر نگاری اور صنف نگاری کی خوبیاں بھی اس کا امتیاز ہیں۔

ادبی تنقید میں اس دور کی کاوشیں خاص طور پر لائق اعتنا ہیں، ادبی تنقید کی نظریہ سازی، عملی ونظری تنقید کے پہلوؤں سے اس دور میں خاصا وقیع کام ہوا، اس دور کے تنقیدی مباحث میں معانی ولفظ، ادب وادیب، موازنۂ ادبا ان کے مدارج وطبقات اور ادبی معرکہ آرائیاں قابل ذکر ہیں، ابن سلام کی طبقات الشعرا، آمدی کی الموازنہ، قدامہ بن جعفر کی نقد النثر ونقد الشعر، جرجانی کی الوساطۃ، العسکری کی کتاب الصناعتین وغیرہ اس دور کی اہم تحریریں ہیں۔

قصہ کی ترقی یافتہ شکل مقامات ہیں، مقامہ حکایتی اسلوب میں ہلکی پھلکی گفتگو کو تعلیم و تربیت کی غرض سے زبان وبیان کے مختلف پیرایوں میں بیان کرنے کا نام ہے، صاحب مقامہ اس میں اپنی تمام معلومات کو الفاظ کے رنگا رنگ جامہ میں پیش کرتا ہے اور ہم قافیہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات ذہن نشین کراتا جاتا ہے، بہ وقت ضرورت ایک ہی بات کو مختلف الفاظ وتراکیب میں ادا کرتا ہے، اس فن کے اساطین بدیع الزماں ہمدانی اور ابومحمد الحریری نمایندہ شخصیتیں ہیں۔

بدیع الزماں ہمدانی کے مقامات میں تعلیم وتربیت کے مختلف موضوعات ملتے ہیں، یہ

مقالے قصص اور محاورتی اسلوب میں لکھے گئے ہیں، ہمدانی کے مقامات کا راوی عیسیٰ بن ہشام اور ہیرو ابوالفتح اسکندری ہے، ان دونوں کی باہمی گفتگو مختلف پیرایوں میں چھوٹے چھوٹے منظم ٹکڑوں اور جملوں میں اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ بسا اوقات یہ جملے نثر مسجع کے بہ جائے نثر مرسل سے قریب محسوس ہوتے ہیں، اس کے مقامات یوں تو اعلا درجہ کے شمار ہوتے ہیں اور ان میں نفسیاتی تحلیل اور دل چسپی کے وافر ذخیرے ہیں لیکن بعض مقامات محض الفاظ و جملوں کا مجموعہ ہیں جن میں نہ کوئی فکر ہے اور نہ نظم۔

مقامات حریری کے خاص موضوعات دین، لغوی پہیلیاں، ادبی معمے اور لطیفے ہیں، جن کو انہوں نے اعلا ادبی اسلوب میں قلم بند کیا ہے، حریری کے مقامات کی زبان زیادہ مرصع اور مسجع ہوتی ہے، مقامات حریری میں مزاحیہ عنصر بھی متوازن انداز میں پایا جاتا ہے لیکن مجموعی طور پر حریری صنعت لفظی کو ترجیح دیتے ہیں، باقی سارے عناصر ان کے یہاں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، اسی رجحان نے آہستہ آہستہ ادب کو فکر وفن سے عاری محض لفظی صنعت گری بنا کر رکھ دیا جو بعد میں عربی ادب کے زوال کا سبب بنا۔

عباسی دور میں فن ترسل نے بھی آہستہ آہستہ لفظی صنعت گری اور لسانی مہارت کے فن کی صورت اختیار کرلی، ترسل دل جوئی، رشد ونصیحت اور توصیہ کے مقاصد سے منحرف ہوکر زبان وبیان میں صنائع وبدائع کے استعمال کے مرحلہ میں داخل ہوتا گیا، اس کوشش میں فنی موشگافیاں ادبی پیچیدگیاں اور لسانی تعقید وغموض کا اضافہ ہوتا رہا اور فن معنویت سے دور اور خارجی حسن سے قریب ہوتا گیا، اس میں اتنا غلو کیا جانے لگا کہ عبارت پُرتکلف ہوتی گئی اور اسلوب کی ندرتیں غرض وغایت قرار پاگئیں، اس صورت حال نے عربی نثر نگاری کو محض الفاظ وجملوں کے بے جان ڈھانچوں میں بدل کر رکھ دیا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب جب عربی ادب میں اس قسم کے انحراف نے سر ابھارا اس کو اس صورت حال سے نکالنے کے لیے سنجیدہ ادبا وعلما کی کوششیں بھی صحت منداثر قائم کرنے میں کامیابی سے سامنے آتی رہیں اور عربی ادب اپنی منزل کی طرف کامیابی وکامرانی سے گام زن رہا۔

(جگہ کی کمی کی وجہ سے مراجع اور حوالے درج نہیں کیے جاسکے)

اخبار علمیہ

قرآن مجید کی پندرہویں بین الاقوامی نمائش ۲۲ر ستمبر تا ۲ر اکتوبر کو تہران میں ہورہی ہے، اس کا افتتاح جمہوریہ اسلامی ایران کے صدر محترم احمدی نژاد کریں گے، اس کا سب سے اہم اور جاذب نظر قرآن کا وہ مذہب نسخہ ہے جو ۱۶۲ اوراق پر لکھا گیا ہے، ان اوراق کی قیمت ۵۹ لاکھ ڈالر بتائی جاتی ہے، اسے ایک روسی کمپنی نے تیار کیا ہے، کمپنی کے ڈائریکٹر نے بتایا کہ اس کے اوراق مقدس تہران بھیجے جاچکے ہیں، رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ یہ نسخہ دنیا کے اس سب سے قدیم نسخہ "مصحف عثمانی" کا عکس ہے، جس پر خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے خون کے دھبے ہیں، ان دھبوں کا عکس قرآن کے ان اوراق زر پر موجود ہے، یہ نادر نسخہ ۱۸ مہینے کی مدت میں ماسکومنٹ میں تیار کیا گیا ہے۔

مصر کی وزارت اوقاف جامع ازہر کے نصاب میں توسیع و تبدیلی کی خواہاں ہے مگر وہاں کی مشہور تنظیم "اخوان الصفا" کے اراکین اس توسیع و تبدیلی کے حق میں نہیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وزیر اوقاف کو جامعہ ازہر اور دینی تعلیم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے اور وہ حقیقت میں مغربی رجحانات سے مرعوب اور امریکی ایجنڈے کے مطابق کام کررہے ہیں، جب کہ مصری وزیر اوقاف محمود حمدی زقزوق نے حکومت کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے ایسی نسل کا ہونا ضروری ہے، جو وسیع علمی و دینی بصیرت کی حامل ہونے کے ساتھ جدید حالات و رجحانات سے بھی واقف ہو، انہوں نے مزید کہا کہ عصر حاضر میں کامیابی کا راز عصری علوم اور جدید ٹیکنالوجی میں پوشیدہ ہے، انہوں نے یہ افسوس ناک حقیقت بھی بتائی کہ جامعہ ازہر کے زیر انتظام کل ۲ لاکھ طلبا و طالبات حصول علم میں مصروف ہیں جن کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت کے لیے ادھر ادھر سرگرداں رہنا پڑتا ہے، دوسری جانب شیخ الازہر سید طنطاوی نے یہ اطلاع دی ہے کہ حکومت مصر نے حفاظ اور معلمین قرآن کے لیے ڈیڑھ کروڑ پاؤنڈ بہ طور انعام مختص کیے ہیں۔

جاپان کی نسان موٹر کمپنی ایک ایسی کار تیار کرنے میں جٹی ہوئی ہے جسے نشے میں دُھت ڈرائیور نہیں چلاسکیں گے، اس کے گیئر میں ایسے حساس آلات ہوں گے جو ہتھیلی کے پسینوں کا معاینہ کرلیں گے اور الکحل کا معمولی حصہ بھی اگر ڈرائیور کی ہتھیلی پر ہوگا تو اس میں لگا ہوا سائرن

آواز دینے لگے گا، نیز اس میں ایک کیمرہ بھی نصب ہوگا جو اس کی آنکھوں کی تفتیش کرکے ڈرائیور کی مستعدی کا پتہ لگالے گا، کار کے اس تفتیشی معیار اور کسوٹی پر اگر ڈرائیور کھرا اترے گا تو کار چلے گی ورنہ نہیں، ایسی کار کی ایجاد کا مقصد کار حادثوں میں کمی پیدا کرنا بتایا جاتا ہے لیکن ابھی اس کی مکمل تیاری میں وقت درکار ہے۔

برطانوی اخبار "ٹیلی گراف" کی اطلاع ہے کہ سائنس دانوں نے ایک ایسا جنریٹر تیار کیا ہے جو ماحولیاتی ارتعاش سے بجلی پیدا کرسکتا ہے، برطانیہ کی ساؤتھ ای پٹن یونی ورسٹی کے شعبہ برقیات سے وابستہ سائنس دانوں کے سر اس ٹیکنالوجی کی ایجاد کا سہرا ہے، ان سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ انسانی جسم میں بہت سی قوتیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کے استعمال سے توانائی پیدا کی جاسکتی ہے، مثلاً زمین پر ایڑیاں رگڑنے سے بھی ایک قسم کی توانائی برآمد ہوتی ہے، ماحولیاتی ارتعاش سے پیدا کی جانے والی بجلی والی اس ٹیکنک کی ترقی کا ایک فائدہ رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ اب موبائل چارج کرنے کے لیے بجلی کے بہ جائے دل کی دھڑکنیں کافی ہوں گی اور موجودہ برقی وسیلہ کی ضرورت نہ ہوگی۔

ایڈنبرا میں قائم رایل نامی رصدگاہ کے ماہرین نے "سیکیو باٹو" نامی ایک ایسا کیمرہ بنایا ہے جس کے ذریعہ خلا کے دور دراز حصوں کا مشاہدہ کیا جاسکے گا اور اس سے نئے سیاروں کی دریافت میں بھی آسانی ہوگی، اب تک کے ایجاد کردہ طاقت ور کیمروں سے ایک ہزار گنا زیادہ طاقت اس میں موجود ہے، ماہرین کے مطابق اس سے مہلک بیماریوں اور بدعنوان افراد کے خفیہ منصوبوں اور حرکتوں کا پتہ لگانے میں بھی مدد ملے گی۔

ٹائمس آف انڈیا میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ اسپین کے علاقہ اٹاپیورکا میں دس لاکھ برس پرانا انسانی دانت پایا گیا ہے، محققین کے بیان کے مطابق یہ یورپ میں اب تک کا سب سے قدیم دانت ہے جو حجری عہد کے آثار و باقیات میں ہے، ان کے نزدیک یہ نہایت قیمتی دریافت ہے اور اس سے انسانوں کے متعلق بہت سے رازہائے سربستہ سے واقف ہونے کے امکانات بڑھ گئے ہیں لیکن ان کے بیان کے مطابق یہ دانت بہت خستہ اور بوسیدہ حالت میں ہے، اس لیے یہ بات مشکل سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ انسانی دانت ہے، واضح رہے کہ اس سے قبل ۱۹۹۴ء میں گران ڈولینا میں حجری عہد کے جو انسانی باقیات ملے تھے، ان کے بارے میں ماہرین کا خیال تھا کہ ۸ لاکھ برس قبل کے ہیں۔

سائنس دانوں نے اشخاص کی صحت کا مکمل ریکارڈ رکھنے والا آلہ "Digital Medistick" کے نام سے ایجاد کیا ہے، ہر لمحہ صحت کی مکمل معلومات دینے کے ساتھ اس کو انسان کے پاس رکھا بھی جاسکتا ہے، اسے ایجاد کرنے والی کمپنی کا نام سوئس ہے، اس میں USB یعنی سونو گرافی سسٹم نصب کیا گیا ہے، فی الحال اس میں پانچ زبانیں رکھی گئی ہیں، اس آلہ میں ڈاٹا سسٹم بھی ہے جس میں نام، پتہ، فون نمبر، عمر، خون کا گروپ وغیرہ مکمل معلومات رکھی جاتی ہیں، ان کے علاوہ بلڈ پریشر، شوگر اور دل کی بیماریوں کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں بھی معلومات موجود ہیں، دوسری معلومات بھی پاس ورڈ کے ذریعہ اس آلہ میں محفوظ کی جاسکتی ہیں۔

سوڈان عیسائی بورڈ کے سربراہ ڈینیل مارکس نے مطالبہ کیا ہے کہ مشنری کالج سوڈان کے تعلیمی پروگراموں کو عمل میں لانے کے لیے ساڑھے تین لاکھ ڈالر کی اضافی رقم دی جائے، تاکہ تبلیغ عیسائیت کا کام مزید بہتر طریقے پر کیا جاسکے، اس کالج سے ہر سال تقریباً ستر عیسائی مبلغین نکل کر افریقی علاقوں میں عیسائیت کی اشاعت کے لیے جاتے ہیں لیکن مارکس کے بہ قول عیسائی مبلغین کی ضرورت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے، ان کی شدید محنت سے اس وقت سوڈان میں ۹ لاکھ سے زیادہ تعداد میں عیسائی ہوگئے ہیں، جس کے سبب خود سوڈان کے مسلمانوں کی دینی اور تہذیبی صورت حال خطرے میں آگئی ہے، یہ رپورٹ ”صراط مستقیم“ نے ”البیان“ کے حوالہ سے لکھی ہے۔

ڈچ انجینئرنگ کالج کے طلبا نے ”روبوسویفٹ“ نام سے محض ۸ گرام وزنی چڑیا نما ہوائی جہاز بنایا ہے، اس میں پرندوں کی طرح کے پر لگے ہوئے ہیں جو کافی لچک دار ہیں اور اڑنے کے دوران ان کا سائز گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، یہ لیتھیم پالیمر بیٹری سے پرواز کرتا ہے، یہ بیٹری ننھے جہاز میں لگے الکٹرو میٹر کو توانائی فراہم کرتی ہے، فی الحال یہ پرندوں کے جھرمٹ کے ساتھ بیس منٹ تک اڑان بھر سکتا ہے، محققین کے مطابق ان ننھے منے جہازوں کا مستقبل میں استعمال پرندوں کی پرواز کا مطالعہ کرنے، فوجیوں اور سڑک پر دوڑتی گاڑیوں اور دیگر تیز رفتار چیزوں کی نگرانی کے لیے ہوسکتا ہے، مارچ ۲۰۰۸ء میں ہندوستان میں ہونے والے پہلے امریکن ایشین مائکرو ہیکل مقابلہ میں اس جہاز کو پیش کیا جائے گا۔

ک۔ص اصلاحی

وفیات

مولانا مختار احمد ندوی

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ راقم کے بڑے کرم فرما اور ملک کے ممتاز عالم دین مولانا مختار احمد ندوی ۹ ستمبر ۲۰۰۷ء کو ممبئی میں انتقال فرماگئے، ان کی تدفین دوسرے روز جوہو قبرستان میں ہوئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مئو شہر کے محلہ ڈشوناتھ پورہ میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد کو جمعیۃ اہل حدیث کے سرخیل مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرت سریؒ سے بڑی عقیدت تھی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ راقم کے والد بھی مولانا امرت سریؒ کے بڑے عقیدت مند تھے اور اکثر ان کا گن گاتے تھے، مولانا مختار احمد کے والد چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی علم دین کی تحصیل کرکے دعوت واشاعت دین کا کام کرے، ان کی یہ آرزو پوری ہوئی اور مولانا مختار احمد برابر دعوت وتبلیغ دین کی خدمت انجام دیتے رہے۔

مئو میں جمعیۃ اہل حدیث کے کئی بڑے مدارس ہیں، انہوں نے جامعہ عالیہ عربیہ اور فیض عام میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں داخلہ لیا اور پھر دار العلوم ندوۃ العلما سے کسب فیض کیا، کچھ عرصے بنارس میں مولانا ابوالقاسم بنارسی کی خدمت میں رہ کر صحیحین کا درس لیا، اس کے بعد وہ دین ودعوت کے کام انجام دینے میں مصروف ہوگئے، پہلے کلکتہ جاکر وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث میں خطیب وامام کی ذمہ داری سنبھالی، ۱۹۶۷ء میں ممبئی آگئے اور مومن پورہ کی جامع مسجد اہل حدیث میں خطابت وامامت کے فرائض انجام دینے لگے، اس کے بعد بنگالی مسجد مدن پورہ کو اپنا مرکز بنایا، بعد میں صرف جمعہ کی امامت کرتے اور خطبہ دیتے تھے، خوش بیان تھے، ان کا خطبہ سننے کے لئے لوگ دور دراز سے آتے، راقم کو بھی یہاں ایک دوبار ان کی اقتدا میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کی سعادت میسر آئی۔

ممبئی میں مولانا مختار احمد صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ الدار السلفیہ کا قیام ہے جو عربی اور اردو کتابوں کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے، حدیث کی کئی امہات کتب کو طباعت کے

جدید معیار کے مطابق یہاں سے شائع کیا، اس ادارے سے کئی اہل علم وابستہ رہ کر تصنیف و تالیف اور عربی کتابوں کی تصحیح و ایڈٹ کا کام انجام دیتے تھے اور خود مولانا بھی تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے تھے، یہاں سے ان کی سرپرستی میں ”البلاغ“ کے نام سے ایک مفید اصلاحی اور دینی ماہوار رسالہ شائع ہورہا ہے جو ان کی محنت اور کدوکاوش سے ایک مفید اور باوقار رسالہ ہوگیا ہے، اس کے کئی کالم وہ خود لکھتے تھے اور اچھے لکھنے والوں سے بھی مضامین حاصل کرکے اس میں شائع کرتے تھے، اس میں ملک کے عام حالات، سیاسی واقعات پر تبصرہ و تجزیہ کے علاوہ متنوع قسم کی دینی معلومات پر مشتمل مضامین شائع ہوتے تھے جو اپنے انداز بیان کی خوبی کی وجہ سے شوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے، ممبئی میں مولانا آزاد ہائی اسکول بھی مولانا کی دین ہے۔

مہاراشٹر کا مشہور صنعتی شہر مالیگاؤں ان کی سرگرمیوں اور قوت عمل کی خاص جولان گاہ تھا، یہاں شہر کے باہر ایک وسیع قطعہ آراضی میں انہوں نے علم و ہنر کا ایک تازہ جہاں آباد کیا تھا اور اس کا نام ”منصورہ“ رکھا تھا، اس میں طلبہ کے لیے جامعہ محمدیہ اور طالبات کے لیے کلیہ عائشہ قائم کیا تھا، مولانا کے نزدیک دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم بھی ناگزیر ہے، ان کے ان اداروں میں دینی علوم کے ساتھ عصری تعلیم بھی اس قدر دی جاتی تھی کہ مہاراشٹر بورڈ سے طلبہ و طالبات ہائی اسکول کرکے کالجوں میں داخلہ لیتے تھے، ان اداروں سے ملحق منصورہ میں ایک طبیہ کالج اور سائرہ اسپتال بھی قائم کیا تھا، طبیہ کالج سے جامعہ محمدیہ کے علاوہ دوسرے اداروں کے طلبہ بھی فیض یاب ہوتے تھے اور سائرہ اسپتال میں طلبہ کو عملی مشق کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔

مولانا مختار احمد نے اپنے آبائی وطن مئو میں بھی عالیہ جنرل ہسپتال اور کلیہ فاطمہ زہرا قائم کیا تھا، یہاں بھی ایک طبی کالج قائم کرنا چاہتے تھے مگر یہ ادارہ عملی جامہ نہیں پہن سکا، بنگلور میں بھی انہوں نے اس طرح کے ادارے قائم کیے تھے اور ان میں بھی دینی و عصری تعلیم دلاتے تھے۔

مولانا کی ایک عظیم الشان دینی خدمت مسجدوں کی تعمیر ہے، انہوں نے ادارۂ اصلاح المساجد کے زیراہتمام ملک کے مختلف حصوں میں سیکڑوں مساجد تعمیر کرائی تھیں، ان کا تعمیری ذوق بہت عمدہ تھا، منصورہ مالیگاؤں میں ایک سے بڑھ کر ایک پرشکوہ اور عالی شان عمارتیں تعمیر کرائیں، ان کی تعمیر کردہ مسجدیں بھی خوب صورت اور پائیدار ہیں۔

اصلاحی و دعوتی، دینی و تعلیمی اور ملی و سماجی کام کرنے میں ان کو بڑی لذت ملتی تھی، جمعیۃ اہل حدیث کے ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے، مدتوں مرکزی جمعیۃ کے نائب امیر پھر قائم مقام امیر اور ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۷ء تک امیر رہے، مسلم پرسنل لابورڈ کے بھی سرگرم ممبر اور برسوں اس کے نائب صدر تھے لیکن آخر میں ان کی توجہ کا اصل مرکز الدار السلفیہ ہوگیا تھا، سفر بھی کم کرتے اور یکسوئی سے صرف تصنیف و تالیف اور لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے تھے، وہ اچھے خطیب و مقرر کی طرح اچھے اہل قلم بھی تھے، مختلف دینی موضوعات پر مفید رسائل و کتب عام فہم اور آسان زبان میں لکھے جن سے مسلمانوں کی ذہنی و فکری اصلاح کے علاوہ عقیدۂ صحیحہ کی ترویج و اشاعت بھی ہوئی۔

مولانا مختار احمد ندوی دارالمصنفین کے مداح اور اس کی خدمات کے قدرداں تھے، جناب سید صباح الدین صاحب مرحوم سے ان کو بڑا لگاؤ تھا، سید صاحب بھی ان کی قوت عمل کے معترف تھے اور وہ جب دارالمصنفین آتے تو ان کی بڑی پذیرائی کرتے، مولانا مختار احمد کی مجھ پر بھی بڑی شفقت تھی، اکثر ٹیلی فون کرکے خیریت معلوم کرتے، مئو یا مشرقی اضلاع میں تشریف لاتے تو اس کا دعوت نامہ مجھے بھی بھجواتے اور اصرار کرکے بلاتے، کبھی دفعتاً مئو آجاتے اور وقت کم ہوتا تو خود دارالمصنفین آجاتے، میں ممبئی جاتا تو میری قیام گاہ کا پتا لگا کر فون کرتے اور گاڑی بھیج کر الدار السلفیہ بلاتے اور گھنٹوں اپنے منصوبوں اور دوسرے علمی، ادبی اور دینی و ملی امور پر تبادلۂ خیال کرتے، اب ایسی محبت کرنے والے لوگ کہاں ملیں گے۔

مولانا مختار احمد صاحب بڑے متحرک اور فعال تھے، انہوں نے گوناگوں دینی، تعلیمی اور قومی و ملی خدمات انجام دیں، اللہ تعالیٰ دین و ملت کے اس خادم کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

مولانا عبدالکریم پاریکھ

یہ خبر بڑے رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ممتاز عالم دین اور مشہور ملی رہنما مولانا عبدالکریم پاریکھ ۱۱؍ ستمبر ۲۰۰۷ء کو ناگ پور میں وفات پاگئے، جہاں ان کا خاندان گجرات سے آکر آباد ہوگیا تھا، وہ ۱۵؍ اپریل ۱۹۲۸ء کو اکولہ (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے تھے، ابتدائی تعلیم

حاصل کر کے یہیں کولڈ ڈرنگ ہوٹل میں ملازمت اختیار کرلی، پھر اپنا کاروبار شروع کیا جس میں اللہ نے بڑی برکت دی اور جلد ہی وہ ناگ پور میں لکڑیوں کے بڑے تاجر شمار کیے جانے لگے۔

کاروباری مشغولیت کے ساتھ علم ومطالعہ اور دین سے بھی ان کو شغف رہا، اسی اثنا میں ان کا تعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ہوا جو روز بہ روز بڑھتا گیا یہاں تک کہ ان کے خلیفہ مجاز ہونے کا فخر حاصل ہوا، مولانا علی میاں ان کی بڑی قدر کرتے اور انہیں اپنے ساتھ جلسوں میں لے جاتے اور ان سے اصلاحی ودعوتی تقریریں کراتے۔

مولانا علی میاں نے پیام انسانیت کی تحریک شروع کی، جس کا مقصد اسلام کے بارے میں غیر مسلموں میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ اور یہ بتانا تھا کہ اسلام ساری انسانیت کے لیے دین رحمت ہے، اس کی تعلیم امن وآشتی، انسان دوستی، اخوت، بھائی چارگی اور اتفاق واتحاد کی ہے، فتنہ وفساد اور ظلم وجارحیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس تحریک میں مولانا عبدالکریم پاریکھ حضرت مولانا کے دست راست ہوگئے تھے اور ان کی تقریروں سے غیر مسلموں کو بڑا فائدہ پہنچتا تھا۔

مولانا عبدالکریم پاریکھ کی جانب مولانا علی میاں کا اعتناد دیکھ کر ندوے کا ہر شخص ان کا گرویدہ ہوگیا تھا اور وہ ندوہ کے مختلف معاملات میں دخیل اور اس کی کئی کمیٹیوں کے ممبر بھی ہوگئے تھے، وہ مسلم پرسنل لا بورڈ اور مسلم مجلس مشاورت کے بھی رکن رکین تھے۔

مولانا علی میاں کے فیض صحبت سے مولانا پاریکھ کی جہاں علمی ودینی استعداد میں اضافہ ہوا وہاں قرآن مجید سے بھی ان کا شغف بہت بڑھ گیا تھا، جس کا ایک مظہر ان کا ادارۂ تعلیم القرآن ہے، اس ادارے سے انہوں نے قرآنیات پر اپنی کئی مفید کتابیں شائع کیں، جو عام فہم اور آسان زبان میں ہیں، ان کی کتاب ''لغات القرآن'' ہماری نظر سے بھی گزری ہے۔

مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے غیر مسلموں میں تبلیغ ودعوت دین کو اپنا خاص محور بنایا تھا، اسی لیے ان کے تعلقات غیر مسلموں سے بھی بہت اچھے تھے اور وہ کسی جھجھک کے بغیر ان تنظیموں کے افراد سے بھی تعلق رکھتے تھے جن سے عام طور پر مسلمان کنارہ کش رہتے ہیں لیکن مولانا ان تک خدا کی باتیں پہنچاتے تھے اور غیر مسلموں کے سامنے بھی اسلامی دعوت پیش کرتے تھے، وہ کئی علاقائی اور ملکی زبانوں سے بھی واقف تھے، جن سے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے میں انہیں

آسانی ہوتی تھی، دعوتی، دینی واصلاحی کاموں کے سلسلے میں وہ ارباب اقتدار سے بھی ملتے رہتے تھے، ان کی وفات قوم وملت کا بڑا سانحہ اور خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

پروفیسر گیان چند جین

پروفیسر گیان چند جین کی وفات اردو دنیا کا بڑا سانحہ ہے، وہ اردو کے صف اول کے ادیب، محقق اور ماہر لسانیات تھے، ان کا انتقال ۱۷/اگست ۲۰۰۷ء کو امریکہ میں ہوا، وہ ۱۹/دسمبر ۱۹۲۳ء کو ضلع بجنور کے سیوہارہ قصبے میں پیدا ہوئے تھے، یہیں اور مراد آباد میں ابتدائی تعلیم ہوئی، پھر وہاں سے حصول تعلیم کے لیے آگرہ گئے اور ۱۹۴۵ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن میں ایم اے پاس کیا، ۱۹۴۷ء میں ان کے تحقیقی مقالے ''اردو کی نثری داستانیں'' پر انہیں پی ایچ ڈی کی تفویض کی گئی۔

۱۹۵۰ء میں انگریزی روزنامہ ''پانیئر'' کے معاون مدیر ہوئے لیکن اسی سال جولائی میں حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا جس کے بعد وہ مدۃ العمر درس وتدریس ہی کی خدمت انجام دیتے رہے اور ایک لائق اور نیک نام استاد کی حیثیت سے شہرت پائی، انہوں نے ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں بھوپال، حیدرآباد، الہ آباد اور جموں وغیرہ میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے خدمت انجام دی، سبک دوش ہونے کے بعد حیدرآباد اور لکھنؤ یونی ورسٹی میں یو جی سی فیلو ایمیریٹس کی حیثیت سے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا، لکھنؤ اندرا نگر میں بود وباش اختیار کرلی تھی، اسی زمانے میں اپنے بعض تحقیقی کاموں کے سلسلے میں مجھے بھی خطوط لکھے تھے، ایک گرامی نامے میں یہ دریافت کیا تھا کہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی کتاب ''شعر الہند'' پہلی مرتبہ کب شائع ہوئی تھی، یہاں جب ان کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تو وہ امریکہ چلے گئے تھے جہاں ان کے بیٹے اور بیٹی رہتی تھیں۔

جین صاحب نے قلم وقرطاس سے ہمیشہ سروکار رکھا، امریکہ جانے کے بعد بھی ان کے مضامین اور تحریریں ''ہماری زبان'' دہلی کی زینت ہوتی تھیں، انہوں نے قریباً ۲۵ کتابیں لکھی تھیں

جو اردو کے ادبی و تحقیقی ذخیرے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں، بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

اردو کی نثری داستانیں، تحریریں، اردو مثنویاں شمالی ہند میں، تفسیر غالب، لسانی مطالعے و تجزیے، شخصیات و مشاہدات، رموز غالب، ذکر و فکر، عام لسانیات، تاریخ ادب اردو (کئی جلدیں)، اردو کا اپنا عروض، کھوج، پرکھ اور پہچان، تحقیق کا فن، ابتدائی کلام اقبال وغیرہ۔

ناموں ہی سے کتابوں کی قدر و قیمت، اہمیت اور بلند پایگی ظاہر ہوتی ہے، ان پر وہ انعامات و اعزازات سے بھی سرفراز کیے گئے، ملک کی متعدد اردو اکیڈمیوں، آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی اور ساہتیہ اکادمی دہلی نے انہیں ایوارڈ دیے۔

پروفیسر گیان چند جین اپنے ان اول درجے کے ادبی و تحقیقی کاموں کی وجہ سے اردو کے ایک کامل الفن اور بلند پایہ مصنف سمجھے جاتے تھے، وہ ان خوش قسمت لوگوں میں تھے جن پر ان کی زندگی ہی میں پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے، کئی یونی ورسٹیوں میں ان کی کتابیں داخل نصاب بھی رہیں لیکن ان کی آخری تصنیف "ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب" اردو حلقے میں بڑی متنازع بنی ہوئی ہے، اس کی تردید اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا اور ابھی تک لکھنے کا سلسلہ بند نہیں ہوا ہے لیکن جناب شمس الرحمان فاروقی اور مرزا خلیل احمد بیگ کے جواب بہت مدلل اور باوزن ہیں، موخر الذکر نے تو اس پر کتاب ہی لکھی ہے۔

مگر اس میں شبہ نہیں کہ جین صاحب ہماری زبان کے بڑے محقق و مصنف تھے، ان کے مقالے اور تصنیفات سے تحقیق کے طلبا اور محققین کو ہمیشہ رہنمائی ملتی رہے گی، وہ اپنے شاگردوں سے بڑی شفقت فرماتے اور خوردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جس کا اعتراف ان کے شاگردوں کو بھی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جین صاحب سچے، کھرے اور صاف گو شخص تھے، اردو حلقے میں ان کی کمی مدتوں محسوس کی جاتی رہے گی۔

جناب قرۃ العین حیدر

اردو کی مشہور ادیبہ اور رجحان ساز افسانہ و ناول نگار محترمہ قرۃ العین حیدر ۲۱/اگست ۲۰۰۷ء کو انتقال کر گئیں، ان کی پیدائش ۲۶/جنوری ۱۹۲۶ء کو علی گڑھ میں ہوئی تھی جہاں ان کے

والد سید سجاد حیدر یلدرم مسلم یونی ورسٹی میں رجسٹرار تھے، مگر ان کی تعلیم لکھنؤ کے کرامت حسین گرلس کالج، آئی۔ٹی کالج اور لکھنؤ یونی ورسٹی میں ہوئی تھی۔

قرۃ العین کے والد اور والدہ نذر سجاد حیدر بھی اردو کے بڑے انشا پرداز تھے، جن کی روایت کو قرۃ العین نے بہت آگے بڑھایا، انہوں نے کم سنی ہی سے لکھنا شروع کیا تھا اور ناول، ناولٹ، افسانے، رپورتاژ، سفرنامے سب میں اپنے جوہر دکھائے، انہیں اردو ادب کی ورجینا وولف کہا جاتا ہے، ادبی دنیا میں ان کو جو شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی وہ کم لوگوں کو ملی، بعض رسالوں نے ان کی زندگی ہی میں ان کے گوشے نکالے تھے، انہوں نے ایک اچھی اور کامیاب مترجم کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی، کئی کتابوں کے اردو سے انگریزی میں اور انگریزی سے اردو میں ترجمے کیے، ہنری جیمز کے ناول "پورٹریٹ آف اے لیڈی" کا ترجمہ "ہمیں چراغ، ہمیں پروانے" کے نام سے کیا تھا، شروع میں ان کا تعلق انگریزی صحافت سے بھی رہا، انہوں نے بی بی سی سے براڈ کاسٹ کے فرائض بھی انجام دیے۔

قرۃ العین کے ناولوں میں آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، کار جہاں دراز ہے، میرے بھی صنم خانے، چاندنی بیگم، سفینۂ غم دل، گردش رنگ چمن اور افسانوی مجموعوں میں پت جھڑ کی آواز، ستاروں سے آگے اور شیشے کا گھر وغیرہ ہیں، آگ کا دریا اور آخر شب کے ہم سفر کو اردو ادب کا شاہ کار خیال کیا جاتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد قرۃ العین اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چلی گئی تھیں لیکن ۱۹۶۰ء میں وہ ہندوستان واپس آگئیں، اس زمانے کے لکھے گئے ان کے ناولوں اور افسانوں میں تقسیم ہند کا درد و کرب بہت نمایاں ہے، انہوں نے اپنے افسانوں میں تقسیم وطن کو "تہذیبی المیہ" اور برصغیر کی ہزار سالہ ہندو مسلم روایت کی شکست کہا ہے، ان کے طبع زاد ناول اور افسانے ہوں یا ترجمے سب اچھے اور اعلا درجے کے ہیں، ان کے اسلوب میں ندرت اور انفرادیت تھی اور ادبی و فنی محاسن کی طرح ان میں تاریخی شعور بھی ملتا ہے، اس لیے ان کی تمام کتابیں مقبول ہوئیں اور ان پر وہ باوقار ادبی اعزاز سے نوازی گئیں، ساہتیہ اکادمی انعام ملا، گیان پیٹھ ایوارڈ سے مفتخر ہوئیں، سویت لینڈ نہرو ایوارڈ، غالب ایوارڈ اور اقبال سمان حاصل کیے، ملک و بیرون ملک کی کئی

یونی ورسٹیوں میں گیسٹ لکچرر رہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وزیٹنگ پروفیسر رہیں، جامعہ کی اکزیکٹیو کونسل نے طے کیا ہے کہ اس کی ایک نئی عمارت ان کے نام سے موسوم ہوگی، ان کی یاد میں ایک سالانہ یادگاری خطبے کا انعقاد کیا جائے گا اور انہیں آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے پس ازمرگ نوازا جائے گا اور ایک چیئر بھی قائم کی جائے گی، حکومت ہند نے ۱۹۸۵ء میں پدم شری اور ۲۰۰۵ء میں پدم بھوشن اعزاز دیے، وہ زندگی بھر مجرد رہیں، ان کی سکونت نوئیڈا میں تھی، کیلاش اسپتال میں زیر علاج تھیں کہ وقت موعود آگیا اور جامعہ کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

ڈاکٹر سید فرید احمد برکاتی

ڈاکٹر سید فرید احمد برکاتی نے یکم جولائی ۲۰۰۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب کے جد امجد مولانا حکیم برکات احمد صاحب اپنے زمانے کے مشہور فاضل، یگانہ استاد اور علوم عقلیہ و حکمیہ میں سرآمد روزگار تھے، یہ بہار سے آکر ریاست ٹونک میں آباد ہوگئے تھے، ٹونک کے والی نے بڑی قدردانی کی اور اپنا خصوصی معالج مقرر کیا، علوم عقلیہ کی طرح طبابت بھی اس خانوادے کا امتیاز تھا، اس میں کئی نامور طبیب گزرے ہیں، ڈاکٹر فرید احمد کے والد بزرگوار شفاء الملک مولانا سید ظہیر احمد برکاتی بھی ایک حاذق طبیب اور ریاست کے نواب صاحب کے معالج خاص تھے۔

یادش بخیر حکیم محمد سعید بانی ہمدرد دواخانہ کراچی کے دست راست اور راقم کے مخلص کرم فرما جناب مسعود احمد برکاتی صاحب اسی خانوادے کے گوہر ناب ہیں، ڈاکٹر فرید احمد اپنی خاندانی ذہانت، علم و فضل، شرافت، ملنساری اور سخاوت کے حامل تھے، آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک سے ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا اور اول پوزیشن حاصل کی، پھر راجستھان یونی ورسٹی سے اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا اور یہیں تدریسی خدمات انجام دے کر ۲۰۰۲ء میں سبک دوش ہوئے۔

ان کا تحقیقی مقالہ ''فرہنگ کلیات میر'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا، اسی زمانے میں پورے

ملک میں مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات منائی جارہی تھیں، راجستھان یونی ورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں بھی مولانا پر سمینار ہوا تھا، اس میں شرکت کے لیے گیا تو ڈاکٹر فرید صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنی کتاب معارف میں تبصرے کے لیے عنایت کی، اس سے ان کی محنت اور لغت میں مہارت کا اندازہ ہوا، سمینار میں ٹونک کے متعدد اہل علم اور برکاتی خاندان کے کئی بزرگوں سے ملاقات ہوئی، ان لوگوں کا شدید اصرار تھا کہ میں ٹونک چلوں اور ریاست کے کتب خانے اور قابل ذکر یادگاروں کو دیکھوں لیکن ریل کا ریزرو ٹکٹ وہاں جانے میں مانع ہوا جس کا ملال آج تک ہے۔

ڈاکٹر فرید احمد کی نظر عربی، فارسی اور اردو لغات اور لسانیات پر اچھی اور گہری تھی اور اس پر انہوں نے بہت سے علمی و تحقیقی مضامین لکھے، ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اپنے تلامذہ سے بھی انہوں نے فرہنگ اور لغات پر تحقیقی کام کرائے جیسے اقبال کے اردو کلام کی مبسوط فرہنگ، کلیات سودا کا تقابلی فرہنگ، کلیات میر حسن کی فرہنگ، فرہنگ نو آئین ہند، قرآن مجید کے اولین دو تراجم کا تاریخی و لسانی جائزہ وغیرہ، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

رام چندر گاندھی

رام چندر گاندھی ۱۳؍ جون کو نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر (IIC) میں انتقال کرگئے، یہ گاندھی جی کے پوتے، راج گوپال آچاریہ کے نواسے اور ہندوستان ٹائمز کے سابق اڈیٹر دیوداس گاندھی کے بیٹے تھے۔

ان کی تعلیم دہلی کے سنٹ اسٹیفن کالج میں ہوئی تھی جہاں وہ فلسفہ کے استاد بھی رہے، یہ ان کا خاص موضوع تھا اور اس میں دہلی یونی ورسٹی اور آکسفورڈ دونوں جگہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی، برطانیہ، امریکہ اور شانتی نکیتن میں بھی فلسفہ کے استاد تھے، اس میں کئی کتابیں لکھیں۔

انہیں بابری مسجد سانحہ کا بڑا دکھ تھا، اس پر ''سیتا کی رسوئی'' کے نام سے جو کتابچہ لکھا تھا، اس میں ثابت کیا ہے کہ جو جگہ مندر کی بتائی جاتی ہے وہاں قبائلی رہتے تھے۔

''ض''

مطبوعات جدیدہ

اقبال اور ممنون: از ڈاکٹر اخلاق اثر، کاغذ، کتابت وطباعت غنیمت، صفحات ۱۸۶ مع ٹائٹل وگرد پوش، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: طارق پبلی کیشنز، صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال۔

بھوپال علم وادب کا گہوارہ رہا ہے، ریاست کے فرماں رواؤں کی علم دوستی اور سرپرستی نے اسے اصحاب علم وکمال کا مرکز بنادیا تھا، علامہ اقبال بھی یہاں متعدد بار آئے اوران کی بڑی پذیرائی ہوئی ، یہاں جن لوگوں سے ان کے مخلصانہ روابط رہے، ان میں ریاست کے اہم عہدوں پر فائز رہنے والے جناب ممنون حسن خاں بھی تھے، انہوں نے سرراس مسعود کے معتمد اور علامہ اقبال کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیے، یہ کتاب ایک حد تک اقبال کی کہانی ممنون کی زبانی ہے، ڈاکٹر اخلاق اثر بھوپال کے جوہر قابل ہیں، ان کی نظر میں جہاں بھوپال کے علمی، ادبی اور ثقافتی جلوے سمائے ہوئے ہیں وہاں ان کو اقبال وممنون سے بھی عشق ہے، انہوں نے علامہ اقبال کے قیام بھوپال اور یہاں ان کی مجلسوں اور لوگوں سے ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی روداد بالکل برجستہ انداز میں بڑے لطف ولذت سے سنائی ہے، زیرنظر کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن بہت کچھ اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس کی اہمیت اس لیے زیادہ ہوگئی ہے کہ اس میں علامہ اور بعض دوسروں کے غیر مطبوعہ خطوط پہلی بار شائع ہورہے ہیں، ممنون خاں صاحب گو ہمیشہ اپنے کو ڈاکٹر اقبال کا خادم اور کفش بردار کہتے تھے مگران سے ان کی قربت اور سرراس مسعود اور نواب حمید اللہ خاں سے ان کے تعلق کی بناپر ان کی بڑی اہمیت ہوگئی تھی اور ڈاکٹر صاحب کے شیدائی ان سے تعلق رکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے اوران سے خط وکتابت کرکے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے، اس طرح اس میں ممنون صاحب سے

متعدد اصحاب کی خط وکتابت بھی درج ہے، اس سلسلے میں ۷۷و۱۹۷۸ء میں اقبال صدی کی تقریبات کے سلسلے میں سردار جعفری سے خط وکتابت کی دستاویزی اہمیت ہوگئی ہے، ممنون صاحب نے مختلف ملاقاتوں میں علامہ اقبال ہی نہیں نواب حمید اللہ خاں، سرراس مسعود، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ کے متعلق جو کچھ بیان کیا تھا اخلاق اثر صاحب نے یہ امانت بھی قارئین کے حوالے کردی ہے، بھوپال کی ریاض منزل اور سیش منزل میں جو نظمیں کہی تھیں وہ سب اس میں مع شانِ نزول نقل کی گئی ہیں، اقبال نے بھوپال سے جن لوگوں کو خطوط لکھے یا یہاں کے جن لوگوں کو لاہور سے خطوط لکھے ان کی تاریخیں، مکتوب الیہم کے نام اور اردو یا انگریزی جس زبان میں لکھے اس کی وضاحت کردی، بھوپال میں اقبال کے نیاز مند بے شمار تھے، اثر صاحب نے چھ نیاز مندوں کا مختصر حال تحریر کیا ہے، جس میں سرفہرست ممنون خاں صاحب ہیں، آخر میں ممنون صاحب کے نام اقبال اور کئی دوسرے حضرات کے غیر مطبوعہ خطوط کے عکس جن کا تعلق بھی کسی نہ کسی حیثیت سے اقبال سے ہے دیے ہیں، یہ کتاب دل چسپ، معلومات افزا اور اقبال کے شیدائیوں کے لیے ایک تحفہ ہے مگر طباعت اچھی نہیں ہے۔

تذکرہ وسوانح حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ: مرتبہ مولانا عبدالقیوم حقانی، تقطیع کلاں، کاغذ وطباعت بہتر، صفحات: ۵۱۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت: تحریر نہیں، پتہ: القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، نوشہرہ۔

مولانا عبدالقیوم حقانی پاکستان کے ممتاز علما میں ہیں، دین کے فروغ اور تعلیم دین کی اشاعت کے لیے انہوں نے صوبہ سرحد کے ضلع نوشہرہ میں جامعہ ابوہریرہ قائم کیا ہے، درس و تدریس کی طرح تصنیف وتالیف کا بھی ان کو ملکہ ہے، القاسم اکیڈمی سے ان کی علمی ودینی تصانیف کے علاوہ ماہوار "القاسم" بھی نکلتا ہے، گزشتہ سال اس کی ایک ضخیم اشاعت "تذکرہ و سوانح حضرت مولانا سید اسعد مدنی" کے نام سے شائع ہوئی تھی، اس میں مولانائے مرحوم کی وفات کے بعد ہندوپاک کے جرائد ورسائل میں جو مضامین شائع ہوئے تھے، ان کو چودہ ابواب

میں مناسب عنوانات کے تحت جمع کر کے شائع کیا گیا ہے، بعض عنوانات سے اس اشاعت خاص کی اہمیت ظاہر ہوگی، نقوش زندگی اور سیرت وسوانح کے روشن پہلو، اوصاف وکمالات اور جامعیت، مولانا سید حسین احمد مدنی کی جانشینی، قیادت، تدبر، سیاسی اور قومی وملی خدمات، سلوک وارشاد، مواعظ وخطبات، منظوم خراج عقیدت وغیرہ، مولانا عبدالقیوم حقانی اس کی اشاعت پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

انیس ودبیر (حیات وخدمات): مرتبہ پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت اچھی، صفحات: ۴۹۲، مجلد مع مصور گرد پوش، قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی۔

میر انیس اور مرزا دبیر اردو کے بڑے شاعروں میں اور مرثیہ گوئی میں بے نظیر تھے، ان دونوں کے سال ولادت کی دوسری صدی پوری ہونے پر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے ایک ہند وپاک سمینار کیا تھا جس میں اردو کے اہم نقادوں، محققوں اور ادیبوں نے شرکت کی تھی، اکثر مقالوں میں ان دونوں شاعروں کی مرثیہ نگاری کے کسی خاص پہلو سے بحث کی گئی ہے، بعض ناقدین نے کسی ایک ہی کو اور بعض نے دونوں کو موضوع بحث بنایا ہے، بعض مضامین رثائی ادب سے متعلق ہیں جیسے "اردو مرثیے کے مختلف مرحلے" (پروفیسر محمد حسن) اور "رثائی ادب کی محتاط تنقید" اور "مرثیے کی سماجیات" (پروفیسر علی احمد فاطمی) اور بعض میں ان شعرا کے فن پر براہ راست گفتگو کرنے کے بجائے ان پر اس سے پہلے کی گئی نقد وتحقیق کا جائزہ لیا گیا ہے، مثلاً میر انیس کے تین نقاد (پروفیسر سید محمد عقیل)، شاگردان دبیر کی ادبی خدمتیں (ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی)، صالحہ عابد حسین کی انیس شناسی (پروفیسر صغری مہدی)، مطالعہ انیس اور کلیم الدین احمد (ڈاکٹر سرور الہدی)، ۲۷ مقالات پر مشتمل اس مجموعے سے انیس ودبیر فہمی میں مدد ملے گی۔

"ض"

☆☆☆☆